الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

بلند مقام ہمیشہ اپنے آپ کو بلند کرنے سے ملتا ہے
نہ کہ نعرے اور جھنڈے کو بلند کرنے سے

اگست ۱۹۸۴ء   قیمت فی پرچہ — تین روپے   شمارہ ۹۳

تذکیر القرآن

جلد اوّل

سورۂ فاتحہ ۔ سورۂ توبہ

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی تفصیلات اور غیر متعلق معلومات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام وخواص دونوں کے لئے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبین قرآن کے لئے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ھدیہ مجلّد: پچاس روپے

مکتبہ الرسالہ

سی - ۲۹ ، نظام الدین ویسٹ ، نئی دہلی ۱۳

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان
اُردو، انگریزی میں شائع ہوتا ہے

اگست ۱۹۸۴ء □ شمارہ ۹۳

زرِ تعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	دوسو روپے
بیرونی ممالک سے:	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

الرسالہ کے لئے بنک سے رقم بھیجتے ہوئے ڈرافٹ پر صرف الرسالہ منتھلی 'AL-RISALA MONTHLY' لکھیں۔

ماہنامہ الرسالہ
سی ۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳
فون نمبر ۶۱۱۱۲۸

فہرست

کہاں بولے گی	۲
قدرت کا قانون	۳
کائنات کو پڑھیے	۴
ہر چیز عجیب	۵
کوئی بچا نہ سکے گا	۶
زوال کی علامت	۷
ترقی کا راز	۸
قدرت کی مثال	۹
کہاں سے کہاں تک	۱۰
اپنے ذہن کا قصور	۱۱
غیر مشرکین کا شرک	۱۲
خدا کا داعی	۱۴
گروہ بندی	۱۵
ایک اور لفظ	۱۶
کیسا عجیب	۱۸
سبق آموز	۱۹
اختلافات	۲۱
اپنی غلطی	۲۳
کامیابی اپنے ہاتھ میں	۲۴
ائمہ کے اقوال	۲۸
الفاظ کا فتنہ	۲۹
اسلامی انقلاب	۳۰
حیوانیت کی سطح پر	۴۵
بدخوش اخلاقی	۴۷

کھال بولے گی

ڈاکٹر آرلین کارنی (Arlene Carney) امریکہ کی الیونائز یونیورسٹی میں سمعیات کے ماہر ہیں۔ان کی تحقیق یہ ہے کہ انسان کے گردوپیش جو آوازیں بلند ہوتی ہیں وہ انسان کی کھال پر اسی طرح نقش ہوتی رہتی ہیں جس طرح ریکارڈ کے اوپر آواز نقش ہوجاتی ہے۔ پروفیسر موصوف نے تجربات کے بعد بتایا ہے کہ مخصوص آلات کے ذریعہ کھال پر منقوش لہروں کو دہرایا جاسکتا ہے ٹھیک اسی طرح جیسے ریکارڈ کی آواز کو گرامون میں دہرایا جاتا ہے۔

پروفیسر موصوف نے اس کو کھال کی آواز (Skin speech) کا نام دیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ جن لوگوں کے کان کا پردہ خراب ہوگیا ہو اور وہ آوازوں کو صحیح طور پر پکڑ نہ پاتا ہو وہ مخصوص الکٹرانک آلات کے ذریعہ اپنی کھال کو اپنے کان کا بدل بنا سکتے ہیں اور کھال پر مرتسم آواز کی لہروں کے ذریعہ اسی طرح بات کو سن سکتے ہیں جس طرح کان کے ذریعے کوئی شخص سنتا ہے (ٹائمس آف انڈیا ۳۰ مئی ۱۹۸۴)

اس تحقیق کو سامنے رکھئے اور پھر قرآن کی سورہ نمبر ۴۱ کی ان آیتوں کو پڑھئے جن میں بتایا گیا ہے کہ:

"اور جس دن اللہ کے دشمن آگ کی طرف لائے جائیں گے۔ پھر جب وہ آجائیں گے تو ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں سب ان کے اعمال کی گواہی دیں گی۔ وہ لوگ اپنی کھالوں سے کہیں گے کہ تم نے کیوں ہمارے خلاف گواہی دی۔ وہ جواب دیں گی کہ اللہ نے ہم کو گویائی دی ہے جس طرح اس نے ہر چیز کو گویائی دی ہے۔اور اسی نے تم کو پہلی بار پیدا کیا ہے اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ اور تم دنیا میں اپنے آپ کو اس سے چھپا نہ سکتے تھے کہ تمہارے کان اور تمہاری آنکھیں اور تمہاری کھالیں تمہارے خلاف گواہی نہ دیں مگر تم نے گمان کیا کہ اللہ کو اس کی خبر ہی نہیں جو تم کرتے ہو۔ اور تمہارے اسی گمان نے جو تم نے اپنے رب کے ساتھ کیا تھا تم کو برباد کیا، پھر تم گھاٹا اٹھانے والوں میں ہوگئے (حم السجدہ ۲۳-۲۰)

امریکی پروفیسر کی مذکورہ تحقیق نے آج کے انسان کے لئے اس بات کو قابل فہم بنا دیا ہے کہ کس طرح انسان کی کھال اس کے اعمال کا ریکارڈ ہے اور وہ قیامت کے دن انسان کے خلاف ایسی گواہ بن جائے گی جس کو جھٹلانا کسی طرح ممکن نہ ہو۔

یہ دریافت ایک طرف قرآن کے کتاب خداوندی ہونے کا ایک حیرت انگیز ثبوت ہے۔ دوسری طرف یہ ایسی سنگین حقیقت ہے کہ اگر وہ کسی کے دل میں بیٹھ جائے تو اس سے ظلم اور سرکشی کا مزاج چھین لے۔

قدرت کا قانون

ہیری ایمرسن فاسڈک نے زندگی کی ایک حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے ــــ کوئی بھاپ یا گیس اس وقت تک کسی چیز کو نہیں چلاتی جب تک اس کو مقید نہ کیا جائے۔ کوئی نیاگرا اس وقت تک روشنی اور طاقت میں تبدیل نہیں ہوتا جب تک اس کو سرنگ میں داخل نہ کیا جائے۔ کوئی زندگی اس وقت تک ترقی نہیں کرتی جب تک اس کو رخ پر نہ لگایا جائے، اس کو وقف نہ کیا جائے، اس کو منظم نہ کیا جائے:

> No steam or gas ever drives anything until it is confined. No Niagara is ever turned into light and power until it is tunnelled. No life ever grows until it is focused, dedicated, disciplined.
>
> Harry Emerson Fosdick, *Living Under Tension*

قدرت کا ایک ہی قانون ہے جو زندہ چیزوں میں بھی رائج ہے اور غیر زندہ چیزوں میں بھی۔ وہ یہ کہ ہر مطلوب چیز کو حاصل کرنے کی ایک قیمت ہے، جب تک وہ قیمت ادا نہ کی جائے مطلوب چیز حاصل نہیں ہوتی۔

یہاں ابھرنے کے لئے پہلے دبنا پڑتا ہے۔ یہاں ترقی کے درجہ تک پہنچنے کے لئے بے ترقی پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ یہاں دوسروں کے اوپر غلبہ حاصل کرنے کے لئے دوسروں سے مغلوبیت کو برداشت کرنا ہوتا ہے۔

ایک بات بظاہر سادہ سی ہے مگر انسان اپنی عملی زندگی میں اکثر اسے بھول جاتا ہے۔ وہ یہ کہ ہم اپنی بنائی ہوئی دنیا میں نہیں ہیں بلکہ خدا کی بنائی ہوئی دنیا میں ہیں۔ جب صورت حال یہ ہے کہ یہ دنیا خدا کی دنیا ہے تو ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم خدا کے بنائے ہوئے قوانین کو جانیں اور اس کے ساتھ اپنے آپ کو ہم آہنگ کریں۔ اس کے سوا کسی اور تدبیر سے یہاں ہم اپنے لئے جگہ حاصل نہیں کر سکتے۔

جو لوگ چاہتے ہوں کہ ان پر یہ مراحل نہ گزریں اور اس کے بغیر وہ ترقی اور کامیابی کے مقام کو پالیں ان کو اپنی پسند کے مطابق دوسری دنیا بنانی پڑے گی۔ کیوں کہ خدا نے جو دنیا بنائی ہے اس میں تو ایسا ہونا ممکن نہیں۔

کائنات کو پڑھئے

قرآن کتاب کائنات کی ڈکشنری ہے۔ یہی بات قرآن میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے یدبر الامر یفصل الآیات (الرعد ۲) یعنی خدا کائنات کا انتظام کر رہا ہے اور (قرآنی آیتوں کے ذریعہ) اس کی تفصیل بیان کرتا ہے۔

ایک شخص کائنات کو دیکھتا ہے۔ وہ اپنی ناسمجھی سے یہ سمجھنے لگتا ہے کہ کائنات ایک اتفاقی حادثہ کا نتیجہ ہے۔ یہاں قرآن اس کو بتاتا ہے کہ نہیں، کائنات ایک صاحب ارادہ کے ارادی منصوبہ کے تحت وجود میں آئی ہے۔

ایک شخص دیکھتا ہے کہ کائنات بظاہر کچھ اسباب کے تحت چل رہی ہے۔ وہ سمجھ لیتا ہے کہ کائنات ایک عظیم خود چالو مشین ہے۔ یہاں قرآن اس کو بتاتا ہے کہ نہیں، کائنات کو خدا کے فرشتے خدا کے حکم سے چلا رہے ہیں

ایک شخص انواع حیات کے بعض ظاہری پہلوؤں کی بنا پر یہ رائے قائم کر لیتا ہے کہ زندگی کی تمام قسمیں سلسلۂ ارتقاء کے تحت وجود میں آئی ہیں۔ یہاں قرآن اس کی رہنمائی کرتا ہے اور اس کو بتاتا ہے کہ نہیں۔ زندگی کی مختلف قسمیں ایک خالق کی تخلیق سے ظہور میں آئی ہیں۔

کائنات کو دیکھئے تو یہاں آرٹ اور کمال کے حیرت انگیز نمونے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں ایٹم رقص کر رہے ہیں۔ یہاں دو بے جان مادے باہم مل کر تیسری نئی چیزیں ڈھل جاتے ہیں۔ یہاں بے شمار ستارے سفر کر رہے ہیں اور ان کی رفتار میں ایک سکنڈ کا بھی فرق نہیں ہوتا۔ یہاں ایک بیج سرسبز درخت کی صورت اختیار کر رہا ہے۔ یہاں زندگی کا سیلاب چاروں طرف رواں دواں نظر آتا ہے۔ اس قسم کے بے شمار عمل یہاں جاری ہیں مگر تمام عمل خاموشی کے ساتھ انجام پا رہے ہیں۔ کائنات کا کوئی کردار اپنا تعارف نہیں کراتا، وہ انسان سے ہم کلام ہو کر اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاتا۔

آدمی یہ دیکھ کر سوچنے لگتا ہے کہ کائنات شاید گونگے فنکاروں کا عجائب خانہ ہے۔ یہاں قرآن اس کو بتاتا ہے کہ موجودہ دنیا کے ہنگامے بے مقصد نہیں۔ ایک وقت آنے والا ہے جب کہ دنیا کی معنویت پوری طرح ظاہر ہو۔ اس وقت تمام چیزیں بول پڑیں گی جس طرح خاموش ریکارڈ گراموفون کی سوئی کے نیچے آتے ہی بولنے لگتا ہے۔ اس دن ان تمام کمیوں کی تلافی ہوگی جو موجودہ دنیا میں نظر آتی ہیں۔ انسان اپنے تمام سوالات کا جواب پا لے گا۔ ہر انسان اپنے اس انجام کو پہنچ جائے گا جہاں باعتبار حقیقت اسے پہنچنا چاہیے۔

ہر چیز عجیب

موجودہ قسم کی چھتری لندن میں سب سے پہلے ۱۷۴۹ میں بنائی گئی۔ اس وقت اس کا تعارف ایک شخص نے ان الفاظ میں کرایا تھا: (ٹائمس آف انڈیا ۲۶ مئی ۱۹۸۴)

When opened it was like a small tent, and when shut it was all curiously jointed and would fold up to the length of a man's hand.

جب اس کو کھولا جائے تو وہ ایک چھوٹے خیمہ کی مانند ہو جاتی ہے اور جب اس کو بند کیا جائے تو حیرت انگیز طور پر وہ ساری سمٹ جاتی ہے اور لمبائی میں ایک آدمی کے ہاتھ کے برابر ہو جاتی ہے۔

موجودہ صدی کی ابتدا میں ہندستان کے ایک دیہات میں ایک زمین دار کے یہاں پہلی بار ہینڈ پمپ لگایا گیا۔ جب اس کو چلایا گیا اور زمین کے نیچے سے وہ پانی کھینچ کر نکالنے لگا تو ایک دیہاتی عورت نے اس کو دیکھ کر کہا: "آدمی صرف موت سے ہارا ہے"

یعنی آدمی سب کچھ کر سکتا ہے۔ صرف ایک موت ایسی چیز ہے جس پر قابو پانا اس کے اختیار میں نہیں۔

دو سو سال پہلے چھتری اور ہینڈ پمپ آدمی کو انتہائی عجیب معلوم ہوتے تھے۔ مگر آج آدمی چھتری اور ہینڈ پمپ کو دیکھتا ہے اور اس کے اندر کوئی استعجاب پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو دیکھتے دیکھتے اب وہ اس کا عادی بن چکا ہے۔ کوئی چیز جب بار بار آدمی کے سامنے آتی ہے تو وہ اپنا انوکھا پن کھو دیتی ہے۔ اس کے بعد انتہائی عجیب چیز بھی اس کے لئے غیر عجیب بن کر رہ جاتی ہے۔

یہی معاملہ خدا کی تخلیقات کا ہے۔ موجودہ دنیا میں جو چیز بھی ہے نہایت عجیب ہے۔ خواہ وہ ایک چھوٹی پتی ہو یا عظیم سمندر ہو، ایک بے نور ذرہ ہو یا روشن آفتاب ہو۔ مگر آدمی پیدا ہوتے ہی ان کو دیکھتا ہے اور ساری زندگی ہر روز دیکھتا رہتا ہے۔ اس طرح برابر دیکھتے رہنے کی وجہ سے ان کا عجوبہ پن اس کی نظر میں ختم ہو جاتا ہے۔ ان کو دیکھ کر آدمی کے اندر استعجاب پیدا نہیں ہوتا۔ اگر انھیں چیزوں میں سے کسی چیز کو وہ اچانک ایک روز دیکھے تو وہ احساس حیرت میں ڈوب جائے۔

یہی موجودہ دنیا میں آدمی کا امتحان ہے۔ اس کو ایک درخت کو اس طرح دیکھنا ہے جیسے کہ وہ پہلی بار اچانک اس کے سامنے کھڑا ہو گیا ہو۔ اس کو ایک سورج کو اس طرح دیکھنا ہے جیسے کہ وہ بالکل پہلی بار اس کے سامنے چمک اٹھا ہو۔ ایک چڑیا کے نغمہ کو اسے اس طرح سننا ہے جیسے کہ اس کے کان پہلی بار اس کے چہچہے سے آشنا ہوئے ہوں۔

کوئی بچانہ سکے گا

مغربی ملکوں کے لوگ عام طور پر گائے کا گوشت کھانا بہت پسند کرتے ہیں۔ آجکل کے زمانہ میں مغرب کے لوگ کثرت سے ہندستان آتے ہیں۔ یہ لوگ جب یہاں کسی "فائیو اسٹار ہوٹل" میں ٹھہرتے ہیں تو وہ توقع رکھتے ہیں کہ ہوٹل کی طرف سے ان کو ان کی تمام مطلوب چیزیں فراہم کی جائیں گی جن میں اپنی پسند کی غذا بھی لازمی طور پر شامل ہے۔ چنانچہ ہوٹل والے اپنے بیرونی گاہکوں کے سامنے جو مینو کارڈ پیش کرتے ہیں ان کی غذائی فہرست میں گائے کا گوشت (Beef steak) کا لفظ بھی شامل رہتا ہے۔

چوں کہ ہندستان میں گائے کا گوشت ممنوع ہے، اس کی خبر اخبار میں چھپی تو اس پر سخت تنقید ہوئی۔ ایک ایم پی نے پارلمنٹ میں اس پر سوال کر دیا۔ حکومت ہند نے اس سلسلے میں ہوٹل والوں سے باز پرس کی۔ ہوٹل والوں کا جواب یہ تھا کہ ہم اپنے گاہکوں کو "بیف" دیتے ہیں اور بیف انگریزی ڈکشنری کے مطابق گائے اور بھینس دونوں کے گوشت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

اخباری رپورٹ (ٹائمس آف انڈیا ۵ مئی ۱۹۸۴) کے مطابق حکومت ہند کے وزیر سیاحت نے ۴ مئی ۱۹۸۴ کو پارلمنٹ میں بیان دیا۔ انھوں نے آکسفرڈ ڈکشنری میں اس لفظ کے معنی پڑھ کر سنائے جس میں بھینس کا گوشت بھی شامل تھا نہ کہ صرف گائے یا بیل کا گوشت:

The minister read out the Oxford dictionary meaning of "beef", which included the flesh of buffalo as well, and not merely that of cow or ox.

اس خبر پر اخبار نے یہ سرخی لگائی ہے: "ڈکشنری نے فائیو اسٹار ہوٹل کو بچا لیا"۔ موجودہ دنیا میں اس قسم کے واقعات دیکھ کر آدمی غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ موت کے بعد کی دنیا بھی ویسی ہی ایک دنیا ہو گی جیسی موت سے پہلے کی دنیا۔ جس طرح "ڈکشنری" موجودہ دنیا میں ہم کو بچا لیتی ہے، اسی طرح وہاں بھی ہم کوئی نہ کوئی ڈکشنری پالیں گے جو ہم کو وہاں کی آفتوں سے بچا لے۔ مگر اس سے بڑی بھول اور کوئی نہیں۔ موجودہ دنیا میں آدمی کا معاملہ اپنے جیسے انسان سے ہے اس لئے وہ لفظی کرتب دکھا کر اس سے بچ جاتا ہے۔ مگر آخرت میں اس کا معاملہ مالک کائنات سے ہو گا۔ اور مالک کائنات کے سامنے کسی قسم کا کوئی کرتب کام آنے والا نہیں۔

آخرت کی دنیا میں حقیقی تدبیر آدمی کو بچائے گی نہ کہ کوئی لفظی تدبیر۔

زوال کی علامت

عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے۔ انھوں نے ایک قبیلہ کو دیکھا کہ اس کے افراد اکثر دبلے اور کمزور نظر آتے ہیں۔ آپ نے قبیلہ کے کچھ لوگوں سے پوچھا کہ کیا بات ہے کہ تم لوگ اتنے لاغر دکھائی دیتے ہو (ما لکم ضویتم)

انھوں نے جواب دیا کہ اے امیر المومنین، اس کا سبب ہماری ماؤں کا ہمارے باپوں سے قریب ہونا ہے (قرب امھاتنا من آبائنا یا امیر المومنین) یعنی ہمارے قبیلہ کے لوگ عرصہ دراز سے یہ کر رہے ہیں کہ وہ صرف آپس میں شادی بیاہ کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ہماری نسلیں کمزور ہوگئی ہیں۔

حضرت عمر نے یہ سن کر فرمایا کہ اجنبیوں میں رشتہ کرو اور شریف بنو۔ (اغربوا انجبوا) یعنی دور دور شادیاں کرو تو تمہارے یہاں طاقت ور اولاد پیدا ہوگی۔

مسلمانوں میں بعد کے زمانہ میں نسب کی حفاظت کا جو ذہن پیدا ہوا اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہ تھا مثلاً سادات صرف سادات میں شادیاں کرنے لگے۔ اگر اس کی کوئی اہمیت ہوتی تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس پر عمل فرماتے۔ حالاں کہ معلوم ہے کہ آپ نے مختلف قبائل اور مختلف نسل کے لوگوں سے نکاح کئے۔ پچھلے انبیاء کے یہاں بھی اس کا اہتمام نہیں ملتا۔ مثلاً حضرت ابراہیم اور آپ کے صاحبزادہ نے خاندان سے باہر شادیاں کیں۔

حقیقت یہ ہے کہ نسب کی حفاظت کا یہ تصور سراسر قومی تصور ہے اور جھوٹے فخر کی پیداوار ہے۔ جب حقیقت باقی نہیں رہتی تو آدمی ظاہر کی حفاظت کرتا ہے۔ یہ دور زوال کی علامت ہے۔ دور زوال میں جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ لوگ حقیقت کے بجائے ظاہری چیزوں کو اہم سمجھ لیتے ہیں اور اسی کی حفاظت میں لگ جاتے ہیں۔

کسی شخص یا قوم کی ناکامی کا سبب ہمیشہ یا تو یہ ہوتا ہے کہ اس نے بیرونی حالات و مشکلات کا کمتر اندازہ کر کے اقدام کر دیا تھا یا اس نے اپنے حصہ کی ذمہ داریوں کو پوری طرح ادا نہیں کیا۔ ان دونوں میں سے کوئی سبب ایسا نہیں جس کا تعلق آدمی کی اپنی ذات کے سوا کسی اور سے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی ناکامی کے بعد اپنے سے باہر اس کی وجہ تلاش کرنا ایک غلطی پر دوسری غلطی کا اضافہ ہے۔ یہ اس وقت کو مزید ضائع کرنا ہے جس کا ایک حصہ پہلے ہی اپنی نادانی سے ضائع ہو چکا ہے۔

ترقی کا راز

ابن بطوطہ (۷۷۹-۷۰۳ھ) چودھویں صدی عیسوی کا مشہور عرب سیاح ہے۔ اس کا پورا نام شمس الدین محمد بن عبد اللہ بن محمد بن ابراہیم اللواتی ہے۔ وہ مغرب کے شہر طنجہ میں پیدا ہوا۔ اس نے تین بار دنیا کے سفر کئے جن کی مجموعی مدت ۲۹ سال ہے۔ وہ جن ملکوں میں گیا ان میں مغرب، الجزائر، تونس، مصر، شام، فلسطین، حجاز، عراق، فارس، یمن، ایشیا مائنر، ترکی، خوارزم، بخارا، افغانستان سیلان، ملایا، انڈونیشیا، ہندستان، چین، جاوا، اندلس، جبرالٹر، مشرقی و مغربی افریقہ، سودان وغیرہ شامل ہیں۔

ابن بطوطہ نے ۱۳۲۵ء سے ۱۳۵۲ء کے دوران تین عالمی سفر کئے۔ ان سفروں کی مجموعی مسافت تقریباً ۷۵۰۰۰ میل ہے۔ ابن خلدون (۸۰۸-۷۳۲ھ) ابن بطوطہ کا ہم زمانہ تھا۔ اس نے اپنے مقدمہ میں مختصر طور پر ابن بطوطہ کا ذکر کیا ہے۔

ابن بطوطہ نے اپنے سفر کے حالات پر کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے تحفۃ النظار فی غرائب الامصار وعجائب الاسفار۔ تاریخ اور جغرافیہ سے متعلق یہ اہم کتاب آج اپنے موضوع پر انتہائی مشہور کتاب بن چکی ہے۔ تاہم ابتدائی پانچ سو سال تک وہ محض ایک مخطوطہ کی صورت میں الجزائر کے ایک کتب خانہ میں پڑی رہی۔ انیسویں صدی عیسوی میں جب فرانسیسیوں نے الجزائر پر قبضہ کیا تو وہ اس کتاب کو حاصل کر کے پیرس لے گئے۔ وہاں اس کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا گیا جو پہلی بار ۱۸۵۳ء میں حواشی کے ساتھ شائع ہوا۔

ابن بطوطہ کا سفر نامہ اصل عربی زبان میں پہلی ۱۸۷۱ میں قاہرہ سے شائع ہوا اور دوسری بار ۱۹۰۴ء میں۔ بعد کو اس کا ترجمہ روسی زبان میں اور یورپ کی اکثر زبانوں میں شائع کیا گیا۔
(الفیصل مئی ۱۹۸۴)

مغربی قوموں نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی حکومتوں کو مٹانے کے لئے ہر قسم کی کوشش کی۔ مگر عین اسی زمانہ میں انھوں نے مسلم کتب خانوں میں پڑی ہوئی بے شمار کتابوں کو اہتمام کے ساتھ چھاپا اور ان کے ترجمے کئے۔ انھوں نے سیاست کے معاملہ کو الگ رکھا اور علم کے معاملہ کو الگ۔ یہی کسی قوم کی زندگی کی پہچان ہے اور اسی میں قومی ترقی کا راز چھپا ہوا ہے۔

قدرت کی مثال

شکاریات کے ایک ماہر نے لکھا ہے (ٹائمس آف انڈیا ۲۱ مئی ۱۹۸۴) کہ شیر اکثر اس وقت مردم خور بن جاتے ہیں جب کہ وہ اتنے بوڑھے ہو جائیں کہ وحشی جانوروں کو نہ پکڑ سکیں۔ مگر دس میں سے ۹ مردم خور شیر وہ ہیں جن کو غلط شکاری زخمی کر دیتے ہیں:

The big cats turn into man-eaters often when they are too old to hunt and trap wild animals. But nine times out of ten, they do so because a poacher has wounded them.

شیر اپنی فطرت کے اعتبار سے مردم خور نہیں۔ مگر وہ تمام جانوروں میں سب سے زیادہ "دشمن خور" ہے۔ شیر جس کو اپنا دشمن سمجھ لے اس کو وہ کسی حال میں نہیں بخشتا۔ عام حالات میں شیر کسی انسان کو دیکھتا ہے تو وہ کترا کر نکل جاتا ہے۔ لیکن ایسے شکاری جن کے پاس اچھے ہتھیار نہ ہوں اور اناڑی پن کے ساتھ شیر پر فائر کریں، وہ اکثر اس کو مار نہیں پاتے بلکہ زخمی کر کے چھوڑ دیتے ہیں۔ یہی وہ شیر ہیں جو مردم خور بن جاتے ہیں، وہ "انسان" کو اپنا دشمن سمجھ لیتے ہیں اور جب بھی انسانی صورت میں کسی شخص کو دیکھ لیتے ہیں تو اس کو ختم کئے بغیر نہیں رہتے۔

یہ زندگی کا ایک قانون ہے۔ وہ جس طرح شیر اور انسان کے لئے درست ہے اسی طرح وہ انسان اور انسان کے لئے بھی درست ہے۔ ایک انسان کا معاملہ ہو یا ایک قوم کا معاملہ، دونوں حالتوں میں دنیا کا اصول یہی ہے۔ جس دشمن کو آپ ہلاک نہیں کر سکتے اس کو زخمی بھی نہ کیجئے۔ کیوں کہ زخمی دشمن آپ کے لئے پہلے سے بھی زیادہ بڑا دشمن ہوتا ہے۔

ایک شخص آپ کا دشمن ہو اور آپ کافی تیاری کے بغیر اس پر وار کریں تو یہ اپنی قبر خود اپنے ہاتھ سے کھودنا ہے۔ اس قسم کے اقدام کے پیچھے بے صبری کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ جن لوگوں کے اندر یہ صلاحیت نہیں کہ وہ سوچ سمجھ کر منصوبہ بنائیں اور خاموش جد وجہد کے ذریعہ اپنے آپ کو مضبوط اقدام کے قابل بنائیں وہی وہ لوگ ہیں جو دشمن پر سطحی وار کر کے دشمن کو اور زیادہ اپنا دشمن بنا لیتے ہیں اور بعد کو شکایت اور احتجاج کا دفتر کھول دیتے ہیں۔ حالاں کہ اس دنیا میں نہ جھوٹے اقدام کی کوئی قیمت ہے اور نہ جھوٹی شکایتوں کی۔

کہاں سے کہاں تک

۵ رمضان ۱۴۰۴ھ کو میں دہلی کے ایک جنازہ میں شریک ہوا۔ موت کے بعد مرنے والے شخص کو نہلایا گیا۔ اس کو نئے کپڑے کا کفن پہنایا گیا۔ لوگوں نے کھڑے ہو کر اس کی نماز جنازہ پڑھی اور پھر میت کو اپنے کاندھوں پر لے کر چلے۔ یہاں تک کہ قبر میں احترام کے ساتھ لٹا کر اس کو ڈھک دیا گیا۔

میں نے سوچا کہ ایک مردہ جسم کے ساتھ اتنے زیادہ اہتمام کا حکم اسلام نے کیوں دیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مرنے کے بعد انسان کا جسم مٹی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، مگر اس کو عام مٹی کی طرح اِدھر اُدھر پھینک نہیں دیا جاتا بلکہ اس کے ساتھ باقاعدہ انسان کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔ "مٹی" کے ساتھ "انسان" جیسا معاملہ کرنے کا حکم مرنے والے کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ زندہ رہنے والے کے اعتبار سے ہے۔ مردہ انسان کے ذریعہ زندہ انسانوں کو سبق دیا جاتا ہے کہ بالآخر ان کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ زندہ لوگ مرنے والے کے روپ میں خود اپنے آپ کو دیکھیں۔ وہ موت سے پہلے موت کا تجربہ کریں۔

یہ تجربہ اس طرح بھی ممکن تھا کہ ایک مقرر دن کو کاغذ کا انسانی پتلا بنایا جائے اور اس کے ساتھ تمام رسوم ادا کر کے اس کو مٹی کے گڑھے میں ڈال دیا جائے۔ اسلام نے اس تجربہ کو حقیقی بنانے کے لئے حقیقی انسان کے مردہ جسم کو استعمال کیا۔

ایک انسان ہماری طرح ایک زندہ انسان تھا۔ چلتے چلتے اس کے قدم جواب دے گئے۔ بولتے بولتے اس کی زبان بند ہو گئی۔ دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں بے نور ہو گئیں۔ لوگوں کے نزدیک اس کی جو قیمت تھی وہ سب اچانک ختم ہو گئی۔ اب خدا اس واقعہ کو استعمال کرتا ہے تاکہ اپنے جیسے ایک انسان کے ذریعہ لوگوں کو زندگی کا سبق یاد دلا دے۔

لوگ اس کو اہتمام کے ساتھ تیار کرتے ہیں اور پھر لے کر چلتے ہیں۔ یہاں تک کہ آخری مرحلہ میں پہنچ کر جب اس کو قبر کے گڑھے میں لٹا دیا جاتا ہے تو ہر آدمی یہ کرتا ہے کہ تین بار اپنے ہاتھ میں مٹی لے کر قبر میں ڈالتا ہے۔ پہلی بار مٹی ڈالتے ہوئے وہ کہتا ہے منها خلقناكم (اسی سے ہم نے تم کو پیدا کیا) جب وہ دوسری بار مٹی ڈالتا ہے تو کہتا ہے وفيها نعيدكم (اسی میں ہم تم کو دوبارہ ڈالیں گے) اور پھر تیسری بار مٹی ڈالتے ہوئے وہ کہتا ہے ومنها نخرجكم تارة اخرى (اور اسی سے ہم تم کو دوبارہ نکالیں گے)

یہ تین بار مٹی ڈالنا اس پورے قصہ کا کلائمکس ہے۔ اس طرح ایک زندہ واقعہ کے ذریعہ بتایا جاتا ہے کہ انسان کیا ہے اور اس کا آخری انجام کیا۔

اپنے ذہن کا قصور

قرآن کی سورہ نمبر ۴ کی ایک آیت حسب ذیل ہے:

افلا یتدبرون القرآن و لو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیراً

النساء ۸۲

کیا لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے۔ اور اگر وہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یقیناً وہ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے

مولانا محمود حسن دیوبندی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اس میں اس کی طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ جو تدبر اور فہم سے کام نہ لے وہ قرآن میں شبہات اور اختلافات کا وہم چلا سکتا ہے۔ مگر فہیم ایسا نہیں کر سکتا۔ دیکھو، جو اسی مقام میں تدبر نہ کرے وہ کہہ سکتا ہے کہ اول تو فرمایا قل کل من عند اللہ (کہو کہ سب اللہ کی طرف سے ہے) اور پھر فرمادیا و ما اصابک من سیئۃ فمن نفسک (اور تجھ کو جو برائی پہنچے وہ تیرے نفس کی طرف سے ہے) سو یہ تو تناقض اور اختلاف ہو گیا۔"

تفسیر قرآن، صفحہ ۱۱۷

انسان کا علم محدود ہے۔ اس لئے اکثر اوقات وہ ایسی رائے قائم کر لیتا ہے جو صرف اس کے ذہن میں ہوتی ہے۔ اس کے اپنے ذہن کے باہر اس کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ اس لئے سنجیدگی اور ذمہ داری کا تقاضا ہے کہ آدمی پوری طرح سمجھے بغیر کوئی رائے قائم نہ کرے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ کوئی خبر معلوم ہو تو پہلے اس کی تحقیق کرو۔ جب بھی کسی کے بارہ میں کوئی ایسی بات سامنے آئے جس سے اس کی ذات یا اس کے کام کے متعلق بری رائے قائم ہوتی ہو تو محض ایک بار سن کر اس کو مان لینا صحیح نہیں۔ آدمی کو چاہئے کہ یا تو اس کے بارہ میں چپ رہے یا قابل اعتماد ذرائع سے اس کی تحقیق کرے۔ جب تحقیق سے بات پوری طرح ثابت ہو جائے اس کے بعد اس کو حق پہنچتا ہے کہ اس کو مانے یا اس کو بیان کرے۔

ضروری تحقیق کے بغیر کسی کے متعلق بری رائے قائم کرنا اللہ کے نزدیک گناہ ہے۔ اور دنیا میں اس کا نقصان یہ ہے کہ سماج کے اندر ایک دوسرے کے خلاف بے بنیاد غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ غیر ضروری شکایتیں وجود میں آتی ہیں۔ لوگوں کے دل ایک دوسرے سے دور ہوتے ہیں اور آپس میں ایسا اختلاف پیدا ہوتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔

غیر مشرکین کا شرک

قدیم زمانہ میں اللہ کے جو پیغمبر اٹھے ان سب کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ ہر ایک کو ان کے مخاطبین نے رد کر دیا۔ ان کو حقیر جانا، ان کی مخالفت میں ہر وہ جارحانہ کارروائی کی جو وہ کر سکتے تھے۔

یہ مخالفت اس قسم کی نہیں تھی جو موجودہ زمانہ میں ان ملکوں کی سیاسی پارٹیوں کے ساتھ دکھائی دیتی ہے جہاں کوئی ڈکٹیٹر حکومت کے تخت پر قابض ہو۔ اس مخالفت کی وجہ سیاسی نہیں بلکہ تمام تر نفسیاتی تھی۔ لوگوں نے غیر خدا کے ساتھ اپنے قلبی جذبات کو وابستہ کر لیا تھا۔ وہ کسی غیر خدا کو عظمت اور تقدس کا مقام دئے ہوئے تھے۔ جب پیغمبر ایک خدا کی معبودیت کا اعلان کرتا اور دوسرے تمام معبودوں کو بے حقیقت قرار دیتا تو اس سے لوگوں کے دل پر چوٹ پڑتی، وہ اپنے بت کو ٹوٹتا ہوا دیکھ کر لڑنے کے لئے کھڑے ہو جاتے۔

قرآن سے یہ ثابت ہے کہ خدا کے جتنے پیغمبر آئے سب کا مشترک پیغام یہ تھا کہ اے لوگو، ایک خدا کو اپنا الٰہ بناؤ اور اسی کی عبادت کرو (اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ) یہ واضح طور پر ایک غیر سیاسی تعلیم تھی۔ اس سے مراد یہ تھا کہ آدمی صرف ایک خدا سے ڈرے اور اسی سے محبت کرے۔ صرف ایک خدا کو وہ اپنی عقیدت اور توجہ کا مرکز بنا لے۔

کسی انسان کی زندگی میں اصل اہمیت کی چیز یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے سوچ اور جذبات کا مرکز کس کو بناتا ہے۔ جس ہستی کو آدمی اس طرح اپنا مرکز توجہ بنائے وہی اس کا معبود ہے۔ پیغمبر یہ بتانے کے لئے آئے کہ موجودہ دنیا میں جو شخص اپنی توجہات کا مرکز خدا کو بناتا ہے وہی ہدایت پر ہے اور موت کے بعد کی زندگی میں وہی کامیاب ہوگا۔ اس کے برعکس جو شخص اپنی توجہات کا مرکز کسی اور کو بنائے وہی وہ شخص ہے جو راہ سے بے راہ ہو گیا۔ اس کے لئے آخرت میں خدا کا انعام پانا مقدر نہیں۔

خدا کے سوا جن چیزوں کو اپنا مرکز توجہ بنایا جاتا ہے وہ عام طور پر چند ہیں۔

۱۔ فطرت کے نمایاں مظاہر، مثلاً سورج، چاند، ستارے وغیرہ

۲۔ قوم کے اکابر۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو تاریخی اسباب کے تحت "بڑا" سمجھ لیا جاتا ہے۔ اور پھر ان کے گرد عظمت و تقدس کی فرضی داستانیں جمع ہونے لگتی ہیں، یہاں تک کہ لوگوں کے ذہنوں میں ان کی ایک افسانوی تصویر بن جاتی ہے، جس کا ابتدائی حقیقی شخصیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

یہی معاملہ کبھی قومی تاریخ کے ساتھ پیش آتا ہے۔ جن لوگوں کا ماضی شاندار رہا ہو، وہ بعد کے دور میں عام طور پر اپنی تاریخ کی پرستش میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان کے لئے ان کی قومی تاریخ حرکت کا سرچشمہ (Source of inspiration) بن جاتی ہے۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے سچے مومن کے لئے اس کا عقیدۂ خدا اس کے لئے حرکت کا سرچشمہ ہوتا ہے۔

اس قسم کی تمام صورتیں شرک کی صورتیں ہیں۔ پیغمبر چونکہ غیر خدا کی پرستش کے تمام طریقوں کو غلط قرار دیتے ہیں اور ان کو بے بنیاد ثابت کرتے ہیں، اس لئے لوگ ان سے بگڑ جاتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں پیغمبروں کی مخالفت حقیقتاً اسی قسم کے جھوٹے معبودوں پر تنقید کی بنا پر ہوتی تھی نہ کہ کسی سیاسی وجہ سے۔

آج بھی یہ منظر ہر جگہ دیکھا جاسکتا ہے۔ آج اگرچہ مظاہر فطرت کی پرستش کم ہوگئی ہے تاہم بقیہ دونوں پرستشیں پورے عروج پر ہیں۔ کہیں اپنے اکابر کی اور کہیں قومی تاریخ کی۔ آج بھی بے شمار لوگ مشرکانہ نفسیات میں مبتلا ہیں۔ خواہ بظاہر وہ اپنے آپ کو مشرک نہ مانتے ہوں۔

کسی شخص کا معبود کیا ہے، اس کی خاص پہچان یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ وہ سب سے زیادہ کس کا تذکرہ کرتا ہے۔ ایک شخص سب سے زیادہ جس چیز کا تذکرہ کرتا ہو، جس کو بڑا ظاہر کرکے اسے لذت ملتی ہو، جس کی یاد سے اس کی روح غذا پاتی ہو، وہی اس کا معبود ہے۔ جس شخص کی زندگی میں یہ مقام خدا کو حاصل ہو وہ موحد ہے اور جس کی زندگی میں خدا کے سوا کوئی اور یہ مقام حاصل کرلے وہ مشرک۔

لوگ خدا کے سوا جس کو اپنا معبود بنالیں اس کے خلاف وہ کوئی بات سننا پسند نہیں کرتے۔ وہ اس وقت تک بالکل ٹھیک دکھائی دیتے ہیں جب تک ان کے مفروضہ معبودوں کو کچھ نہ کہا گیا ہو۔ مگر جیسے ہی ان کی محبوب شخصیت پر تنقید کی جائے یا ان کی پرفخر تاریخ پر کوئی اظہار رائے کیا جائے، وہ فوراً بپھر اٹھتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں پتھر کے بت ہوا کرتے تھے۔ موجودہ زمانہ میں لوگوں نے نفسیاتی بت بنالئے ہیں۔ آج کا انسان اپنے نفسیاتی بت کے ٹوٹنے پر اسی طرح شدید ردعمل کا اظہار کرتا ہے۔ جس طرح قدیم زمانہ کے مشرک اپنے پتھر کے بتوں کے ٹوٹنے پر شدید ردعمل ظاہر کرتے تھے۔

جب آدمی دوسری چیزوں سے اس طرح محبت کرے جس طرح خدا سے محبت کرنا چاہئے، جب دوسری شخصیتوں سے اس کو وہ قلبی وابستگی ہو جائے جس کا حقدار صرف اس کا خدا ہے تو یہی غیر خدا کو اپنا خدا بنانا ہے۔ ایسے تمام لوگ خدا کے نزدیک شرک کے مجرم ہیں، خواہ دنیا میں بظاہر وہ دین اور توحید کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہوں۔

خدا کا داعی

داعی بننا خدا کا پیغام بر بننا ہے۔ خدا کا پیغام بر وہی بن سکتا ہے جو خدا سے پاکر بولے اور خدا سے سن کر کلام کرے۔

خدا ملفوظ کلام میں بھی بولتا ہے اور غیر ملفوظ کلام میں بھی۔ خدا کا ملفوظ کلام رسولوں کے لئے خاص ہے اور وہ آخری رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) پر ختم ہوگیا۔ موجودہ دنیا میں اب خدا کسی سے ملفوظ زبان میں کلام کرنے والا نہیں۔

مگر خدا کا غیر ملفوظ کلام بدستور جاری ہے۔ جس طرح کسی شخص کے پیغمبر ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اس کو خدا کا ملفوظ کلام پہنچے۔ اسی طرح داعی وہی شخص بن سکتا ہے جو خدا کے غیر ملفوظ کلام کا آخذ (Recipient) ہو۔ جس کو خدا کا غیر ملفوظ کلام مسلسل مل رہا ہو۔ کوئی شخص وحی کے بغیر پیغمبر نہیں بن سکتا۔ اسی طرح کوئی شخص خدا کا داعی نہیں بن سکتا جب تک اس کی رسائی خدا کے غیر ملفوظ کلام تک نہ ہو جائے۔

خدا ہواؤں کو اپنا سفیر بنا کر بھیجتا ہے۔ خدا چڑیوں کی صورت میں اپنا نغمہ بکھیرتا ہے۔ خدا دریا کے تموج کے ذریعہ آواز دیتا ہے اور سورج کی روشنی کے ذریعہ اپنی مرضی سے مطلع کرتا ہے۔ وہی شخص داعی ہے جو خدا کے ان اعلانات کو سن کر اسے دوسروں کو سنانے کے لئے اٹھے۔ جو شخص اس کے بغیر خدا کا داعی بن کر کھڑا ہو جائے وہ خدا کا مجرم ہے نہ کہ خدا کا داعی۔

داعی حقیقۃً وہ ہے جس کے بارہ میں خدا کے فرشتے گواہی دیں کہ خدایا تیرا یہ بندہ وہ ہے جو دوسروں کو وہ چیز دینے کے لئے اٹھا جس کو اس نے تجھ سے پایا تھا۔ تو آسمانوں کے ذریعہ جس حقیقت کا اعلان کر رہا تھا اس کو اس نے سنا اور تیرے بندوں کو اسے سنایا۔ تو نے سورج اور چاند کے ذریعہ جس ہدایت کو کھولا اس کو تیرے اس بندے نے پڑھا اور لوگوں کو اسے پڑھوایا۔ تو درختوں اور پہاڑوں کے ذریعہ اپنی جس مرضی کو ممثل کر رہا تھا اس کو اس نے پہچانا اور لوگوں کو اس سے آگاہ کیا۔

دعوت کا عمل ایک انتہائی زندہ عمل ہے۔ داعی کو ہر روز نئی چیز دریافت کرنا چاہئے۔ اس کو ہر روز خدا کا نیا فیضان ملنا چاہئے۔ ساری کائنات کو اس کے لئے نہ ختم ہونے والا دستر خوان بن جانا چاہئے۔ اگر ایسا نہ ہو تو داعی جمود کا شکار ہو جائے گا۔ اور جو شخص جمود کا شکار ہو جائے وہ خود موت سے دوچار ہو چکا ہے۔ وہ دوسروں کو زندگی کا پیغام کیا دے گا۔

گروہ بندی

ائمہ اربعہ نے ضرورت کے احساس کے تحت بہت سے نئے مسائل وضع کئے۔ مگر وہ کتاب اور سنت ہی کو دین کا اصل مرجع سمجھتے تھے۔ ان کو کبھی گمان نہ تھا کہ ان کے وضع کردہ مسائل دین کا مقام حاصل کرلیں گے۔ چنانچہ وہ کہتے تھے کہ کسی شخص کے لئے جائز نہیں کہ وہ ہمارے قول پر فتویٰ دے بغیر اس کے کہ اس کو ہماری دلیل کا علم حاصل ہو (لا یجوز لاحد ان یقول قولنا من غیر ان یعرف دلیلنا)

مگر بعد کے زمانہ میں یہ صورت باقی نہ رہی حتیٰ کہ وہ وقت آیا کہ لوگ بس اپنے امام کے قول کو سب کچھ سمجھنے لگے۔ انسانی فقہ نے خدائی شریعت کی جگہ لے لی۔ اب امام کرخی کو یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ ہر آیت یا حدیث جو اس سے ٹکراتی ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں وہ یا تو قابل تاویل ہے یا منسوخ ہوچکی ہے۔ (کل آیۃ اوحدیث یخالف ماعلیہ اصحابنا فھو مؤول اومنسوخ، فقہ السنۃ، مجلد اوّل، صفحۃ ۱۳)

جب قوم پر گراوٹ کا یہ دور آتا ہے اسی وقت اس کے اندر تحزب پیدا ہوجاتا ہے۔ ہر ایک اپنے مسلک کو اصل دین سمجھنے لگتا ہے۔ قوم مختلف قسم کے متحارب فرقوں میں بٹ جاتی ہے۔ دین کا اصل سرا لوگوں کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ ہر ایک کا وہ حال ہوجاتا ہے جو قرآن کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے: وتقطعوا امرھم بینھم زبراً کل حزب بما لدیھم فرحون)

مشن میں شرکت

اگر آپ الرسالہ کے پیغام سے متفق ہیں اور پھر بھی آپ نے ابھی تک الرسالہ کی ایجنسی نہیں لی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ——— آپ نے اس مشن میں اپنے آپ کو شامل نہیں کیا۔ جو شخص بھی الرسالہ کے مشن سے اتفاق رکھتا ہو اس کے اتفاق کا کم سے کم تقاضا ہے کہ وہ الرسالہ کی ایجنسی لے۔

ادارہ الرسالہ

ایک اور لفظ

ایک صاحب الرسالہ کے دفتر میں آئے۔ لباس سے معلوم ہوتا تھا کہ انگریزی تعلیم یافتہ ہیں۔ انھوں نے الرسالہ مئی ۱۹۸۴ کا صفحہ ۴ کھولا اور فرمایا " دیکھئے، یہ آپ نے غلط ترجمہ کیا ہے" اس کے بعد انھوں نے مذکورہ صفحہ میں انگریزی لفظ Dessert پر انگلی رکھتے ہوئے کہا کہ اس کا ترجمہ آپ نے صحرا کر دیا ہے۔ حالاں کہ یہ لفظ انگریزی زبان میں مٹھائی پھل وغیرہ کے لئے بولا جاتا ہے جو کھانے کے بعد کھائے جاتیں۔ صحرا کے لئے انگریزی میں جو لفظ ہے وہ Desert ہے (پہلے لفظ میں دو ایس اور دوسرے لفظ میں ایک ایس)

میں نے کہا کہ جناب، آپ کے سوال کا جواب دینے سے پہلے میں خود ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ براہ کرم بتائیں کہ کیا آپ انگریزی لفظ Pun سے واقف ہیں۔ وہ چپ ہو گئے۔ دوبارہ پوچھنے پر بتایا کہ میں Pun کے معنی نہیں جانتا۔ میں نے کہا کہ مذکورہ عبارت میں Dessert اور Desert کے ترجمہ کے معاملہ کو سمجھنے کے لئے اس دوسرے لفظ (پن) کو جاننا ضروری ہے۔

پھر میں نے کہا کہ صدر ریگن کے مذکورہ فقرہ میں دراصل وہ ادبی اسلوب استعمال ہوا ہے جس کو انگریزی میں Pun اور اردو میں ایہام کہتے ہیں۔ اس سے مراد ایسے الفاظ کا مزاحیہ استعمال ہے جو بولنے میں مشابہہ ہوں مگر معنی میں مختلف ہوں۔ جیسے ایک شیعہ مصنف نے اورنگ زیب کی افواج کے بارہ میں یہ جملہ لکھا ہے ــــــ "مردان بطالت شعار" بطالت کے ایک معنی شجاعت کے ہیں۔ مگر اس لفظ کا دوسرا مفہوم بھی ہے جو باطل کے ہم معنی ہے۔ اس طرح مصنف نے بظاہر ایک اچھا لفظ بول کر توریہ کے انداز میں فوجیوں کی تنقیص بھی کر دی۔

صدر ریگن کے مذکورہ فقرہ میں یہی ادبی اسلوب پایا جاتا ہے۔ ریگن نے اپنی خوراک سے متعلق سوال کے ذیل میں ڈزرٹ (میٹھی چیزوں) کا لفظ استعمال کیا۔ ایک بوڑھے آدمی کی زبان سے یہ بات بظاہر عجیب تھی۔ چنانچہ انٹرویو لینے والے نے دوبارہ سوال کیا۔ اب ریگن نے صوتی اشتراک سے فائدہ اٹھایا اور ایہام کے اصول پر مسکرا کر کہا ہاں ڈزرٹ Dessert مگر عرب جیسا ڈزرٹ جہاں نیل پایا جاتا ہو۔

اس قسم کی لفظی صنعت ہمیشہ اس خاص زبان کے اعتبار سے ہوتی ہے جس میں وہ استعمال ہوئی ہے۔ اب اگر اس انگریزی فقرہ کا اردو میں بالکل لفظی ترجمہ کر دیا جائے تو مطلب خبط ہو جائے گا۔ دوسری

صورت یہ ہے کہ لفظی ترجمہ کرکے اس کے ساتھ ایک تشریحی نوٹ کا اضافہ کیا جائے۔ دونوں صورتیں غیر احسن ہیں۔ کیوں کہ ان سے کلام کی لطافت مجروح ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ترجمہ میں مفہوم کی رعایت کی گئی۔

کبھی ایک "لفظ" کی حقیقت جاننے کے لئے ایک اور "لفظ" کو جاننا ضروری ہوتا ہے مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس راز کو سمجھتے ہوں۔

یہاں دوسری نوعیت کی ایک مثال لیجئے۔

۱۸۵۷ میں انگریزوں کے خلاف ہندستانیوں کی بغاوت ناکام ہوگئی۔ اس کے بعد انگریزوں نے اپنی حکومت کے استحکام کے لئے مقامی باشندوں پر سختی شروع کی۔ جس شخص کے متعلق ذرا بھی مخالف انگریز ہونے کا شبہہ ہوا اس کو فوراً پکڑ کر سخت ترین سزا دی گئی۔

اس زمانہ کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ کچھ مسلم علماء کو صرف اس بنا پر سزائیں دی گئیں کہ انھوں نے انگریزوں کو "نصاریٰ" کہا یا لکھا تھا۔ اس زمانہ کے انگریز حکمرانوں نے بعض مسلمانوں کی تحریروں میں اپنی بابت "نصاریٰ" کا لفظ دیکھا تو سمجھا کہ یہ ان کو حقیر کرنے کے لئے ہے۔ دور قدیم کے یہودی حضرت عیسیٰ کو حقارت سے ناصری کہتے تھے۔ یعنی ناصرہ نامی گاؤں کا رہنے والا۔ انھوں نے سمجھا کہ اسی طرح مسلمانوں نے انگریزوں کو "نصاریٰ" کہنا شروع کیا ہے۔ وہ ناصری اور نصاریٰ کو ہم معنی سمجھتے تھے۔ یہ معاملہ یہاں تک بڑھا کہ سرسید نے ایک کتابچہ شائع کیا جس کا نام تھا "تحقیق لفظ نصاریٰ"۔ انھوں نے اس کتابچہ کو اردو کے علاوہ انگریزی میں چھپوا کر برطانی حکمرانوں تک پہنچایا۔

انگریزوں کا یہ خیال سراسر غلط فہمی پر مبنی تھا۔ ناصری قریہ ناصرہ کی طرف نسبت کرکے بنا ہے جب کہ نصاریٰ کا تعلق انصار سے ہے۔ یعنی مدد کرنے والا۔ حضرت مسیح کے زمانہ میں قوم یہود کے جو چند افراد حضرت مسیح کی نصرت کے لئے اٹھے ان کو انصار یا انصاری کہا گیا۔ اسی سے لفظ نصاریٰ بنا ہے۔

یہ ایک آفاقی حقیقت ہے جو زندگی کے ہر معاملہ میں چھپی ہوئی ہے۔ ہر معاملہ میں یہ صورت حال ہے کہ ایک بات کو سمجھنے کے لئے دوسری کئی باتوں کو جاننا ضروری ہوتا ہے۔ ایک لفظ کے معنی آدمی اسی وقت بخوبی طور پر سمجھ پاتا ہے جب کہ وہ دوسرے بہت سے الفاظ سے واقفیت رکھتا ہو۔ جو لوگ جزئی واقفیت کی بنیاد پر اپنے کو جاننے والا سمجھتے ہیں یا چند باتوں کو سن کر نازک امور میں بڑے بڑے بیان دینے لگتے ہیں ان کے بارہ میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ یا تو غیر سنجیدہ ہیں یا غیر عاقل۔ اس کی کوئی تیسری توجیہہ نہیں کی جا سکتی۔

کیسا عجیب

ایر انڈیا کا ایک جہاز ۳ جون ۱۹۸۴ کو بنکاک سے بمبئی کے لئے اڑا۔ یہ بوئنگ ۷۴۷ تھا۔ اس میں چار انجن نصب تھے اور عملہ کے علاوہ ۱۵۲ مسافر سوار تھے۔ جہاز ابھی فضا میں پہنچا تھا کہ اس کے ایک انجن میں آگ لگ گئی۔ تاہم کپتان ورما نے ہوشیاری کی اور جہاز کو قریب کے ہوائی اڈہ ڈون موانگ Don Muang پر اتار لیا۔ اڑنے کے ۲۰ منٹ بعد جہاز دوبارہ زمین پر تھا۔

پائلٹ کی ہوشیاری سے جہاز حفاظت کے ساتھ رن وے پر اتر گیا جہاں ریڈیائی اطلاع پاکر پہلے سے آگ بجھانے والے انجن موجود تھے۔ تاہم بہت سے مسافر زخمی ہو گئے اور انھیں فوری طور پر اسپتال پہنچایا گیا۔ اس کی وجہ جہاز کا حادثہ نہیں تھا۔ بلکہ اخباری رپورٹ۔ (ٹائمس آف انڈیا ۴ جون ۱۹۸۴) کے مطابق اس کی وجہ یہ تھی :

Most of the injuries were due to passengers rushing for the emergency exit from where they descended through a chute.

یعنی بیشتر زخموں کی وجہ مسافروں کا آپس کا ٹکراؤ تھا۔ کیوں کہ جب جہاز اترا تو مسافر تیزی سے دروازہ کی طرف دوڑ پڑے جہاں انھیں ایک ڈھلوان گاڑی سے نیچے اترنا تھا۔

جہاز کی آگ نے ابھی کسی کو پکڑا نہیں تھا۔ صرف یہ اندیشہ تھا کہ شاید پکڑ لے اور آدمی جل کر مر جائے۔ تاہم اس اندیشہ نے لوگوں کو اتنا بدحواس کر دیا کہ وہ ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ ان میں سے ہر شخص یہ چاہنے لگا کہ سب سے پہلے وہ بھاگ کر آگے نکل جائے۔

مگر ایک اس سے زیادہ ہولناک خطرہ آدمی کا پیچھا کر رہا ہے۔ وہ موت اور اس کے بعد قیامت کا خطرہ ہے۔ لیکن کسی کو اس کے اندیشہ سے بدحواسی نہیں۔ کوئی اس سے بھاگنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ کس قدر سچ فرمایا پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم نے کہ میں نے جہنم کی آگ سے خوفناک چیز نہیں دیکھی جس سے بھاگنے والا بے خبر سو گیا ہو (ما رأیت مثل النار نام ھاربھا)

آدمی کو موجودہ دنیا میں سب سے زیادہ جو چیز متحرک کرتی ہے وہ "خوف" ہے۔ خوف کی نفسیات عمل کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے۔ آخرت کا خوف تمام خوفوں میں سب سے بڑا خوف ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آخرت کا خوف واقعی معنوں میں کسی کے اندر پیدا ہو جائے تو وہ آدمی کی پوری شخصیت کو جگا دے گا۔ وہ اس کی تمام قوتوں کو متحرک کر دے گا۔

سبق آموز

فتح پور سیکری شہنشاہ اکبر (۱۶۰۵-۱۵۴۳) کا دارالسلطنت تھا۔ یہ آگرہ سے ۴۵ کیلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہاں دوسری بہت سی عمارتوں کے ساتھ ایک شاہی "عبادت خانہ" بھی تھا۔ یہ عبادت خانہ اکبر کے بعد زمین کے نیچے دب گیا اور اس کے اوپر گھاس اور درخت اگ آئے۔ حال میں حکومت ہند کے محکمہ آثار قدیمہ اور مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے مشترک منصوبہ کے تحت اس کی کھدائی کی گئی ہے اور اس کو باہر نکالا گیا ہے (ٹائمس آف انڈیا ۸ جون ۱۹۸۴)

اس عبادت خانہ میں شہنشاہ اکبر علماء کی صحبت میں بیٹھا کرتا تھا۔ اور ان سے مذہب کے موضوعات پر گفتگو کرتا تھا۔ یہیں اس نے اپنا مشہور "دین الٰہی" وضع کیا۔ اس کا خیال تھا کہ ہندستان میں مختلف مذاہب کے ماننے والے بستے ہیں۔ اس لئے کسی ایک مذہب کی بنیاد پر یہاں سیاسی استحکام حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

اس نے یہ رائے قائم کی کہ اس ملک میں مغل سلطنت کی بنیاد اس وقت تک مضبوط نہیں ہوسکتی جب تک یہاں کے لوگوں کا مذہب ایک نہ ہوجائے۔ تبلیغ کے ذریعہ مذہب کو بدلنا اس کو مشکل نظر آیا۔ چنانچہ اس نے ایک نیا مذہب (دین الٰہی) ایجاد کیا۔ جس میں بزعم خود اس نے تمام مذاہب کی خصوصیات جمع کرنے کی کوشش کی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ نیا مذہب اپنی مشترک خصوصیات کی بنا پر ملک کے تمام باشندوں کے لئے قابل قبول ہوجائے گا۔

دین الٰہی کی تصنیف کے دوران اس کو عیسائی مذہب کے بارے میں جاننے کی ضرورت پیش آئی۔ اس نے پرتگال کے عیسائی بادشاہ کو خط لکھا کہ اس کو انجیل کے فارسی ترجمے کی ضرورت ہے۔ شاہ پرتگال نے یہ فارسی ترجمہ بھیج دیا۔ تاہم اس کا مطالعہ اکبر کے لئے کافی نہ ہوسکا۔ اس کے بعد اکبر نے پوپ (روم) کو لکھا کہ مسیحیت کی تعلیم کے لئے اس کے پاس معلم بھیجے جائیں۔ پوپ نے فوراً دو تربیت یافتہ افراد ہندستان روانہ کر دئے۔

ایک فادر اکوا ویوا (Fr. Acquaviva) اور دوسرا فادر مانسریٹ (Fr. Monserrate) یہ دونوں صاحبان ۲۸ فروری ۱۵۹۰ء کو فتح پور سیکری پہنچے۔ "اکبر نامہ" کی ایک پینٹنگ میں اکبر ان عیسائی معلمین سے محو گفتگو نظر آتا ہے۔

اکبر نے ان دونوں عیسائی معلمین کو شاہی عبادت خانہ کے پاس "خوشبو خانہ" میں ٹھہرایا۔ مگر یہ دونوں مسیحی صرف "معلم" نہ تھے۔ بلکہ وہ اپنے مذہب کے تربیت یافتہ مبلغ تھے۔ چنانچہ انھوں نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ خوشبو خانہ کو گرجا گھر میں تبدیل کر دیا۔ یہ شمالی ہند کا پہلا گرجا گھر تھا جو اکبر کے زمانہ میں قائم ہوا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ فادر اکوا و یوا نے پوپ کو جو رپورٹ بھیجی تھی اس میں اس نے لکھا کہ میرا احساس یہ ہے کہ اکبر ذہنی طور پر اس کے لئے تیار ہو رہا ہے کہ وہ مسیحیت کو قبول کر لے۔ مگر اس سے اکبر کا اصل مقصد (سلطنت کا استحکام) حاصل نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے اکبر ایسے اقدام سے باز رہا۔

اس واقعہ میں دو بڑے سبق ہیں۔ ایک سبق یہ کہ دولت اور اقتدار کا حصول اکثر عقل سے محرومی کی قیمت پر ہوتا ہے۔ کسی آدمی کو جب دولت اور اقتدار مل جاتا ہے تو اکثر اس کو وہ ایسے کاموں میں ضائع کرتا ہے جس کا کوئی نتیجہ نکلنے والا نہیں۔ شہنشاہ اکبر نے سیاسی خوش خیالی تحت "دین الہی" وضع کیا تھا۔ اس پر اس نے سلطنت کے بے پناہ وسائل خرچ کئے۔ حالاں کہ اس کا انجام بالآخر یہ ہونا تھا کہ وہ تاریخ کے ملبہ کے نیچے دب کر رہ جائے اور آثار قدیمہ کے طالب علموں کے سوا کسی اور کو اس سے دلچسپی نہ رہے۔

دوسرا سبق دعوتی ہے۔ اکبر نے پوپ سے مسیحی معلم مانگے اور اس نے فوراً دو تیار شدہ افراد اس کے پاس بھیج دئے۔ جب کہ مسلمانوں سے جدید دور میں بار بار یہی تقاضا کیا گیا ہے مگر وہ اس تقاضے کو کبھی پورا نہ کر سکے۔ مسیحی ادارے اپنی مشنری اسپرٹ کی وجہ سے سیکڑوں سال سے اس پوزیشن میں ہیں کہ مشرق و مغرب میں اپنے تربیت یافتہ افراد بھیج سکیں۔ جب کہ مشنری اسپرٹ سے محروم ہو کر مسلمانوں کا یہ حال ہو رہا ہے کہ ان کے پاس نہ مشرقی ضرورت کے مطابق خدا کے دین کے مبلغ موجود ہیں اور نہ مغربی ضرورت کے مطابق۔

دور جدید میں مسلمانوں کی بربادی کا واحد سب سے بڑا سبب یہی ہے۔ مسلمانوں کی حیثیت خدا کے گواہ کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی عملی سرگرمیوں کا اصل نشانہ صرف ایک ہے اور وہ دعوت ہے۔ جن لوگوں کی نظریں اس نشانہ پر جمی ہوئی ہوں وہ اپنے لئے عمل کا صحیح میدان پالیں گے اور جب نظریں اس نشانہ سے ہٹ جائیں تو تمام قوتیں منتشر ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس کے بعد وہ ایک ایسی قوم بن جاتے ہیں جس کا کوئی مقصد نہ ہو۔ وہ ایسا گروہ بن جاتے ہیں جس کا کوئی اقدام نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکے۔

اختلافات

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے معراج کی رات میں اپنے رب کو دیکھا یا نہیں دیکھا، اس کے بارے میں صحابہ کے درمیان دو رائیں ہیں۔ حضرت عبد اللہ ابن عباس اور اکثر صحابہ رویت کے قائل تھے۔ ان کا خیال تھا کہ معراج کی رات میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کو اسی طرح دیکھا جیسے کوئی شخص کسی چیز کو دیکھتا ہے۔

مگر حضرت عائشہ کا خیال اس کے برعکس تھا۔ مسروق کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ سے پوچھا کہ کیا رسول خدا نے معراج میں اپنے رب کو دیکھا تھا۔ حضرت عائشہ نے کہا۔ تم نے ایسی بات اپنے منہ سے نکالی ہے کہ میرے سر کے بال کھڑے ہو گئے۔ تین باتیں ایسی ہیں کہ جو بھی ان کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا ہے۔ جو تم سے کہے کہ محمد نے اپنے رب کو دیکھا اس نے جھوٹ کہا۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار (الانعام ۱۰۳)

اتنے نازک معاملہ میں اتنے بڑے اختلاف کے باوجود صحابہ کے درمیان نہ جھگڑے پیدا ہوئے اور نہ فرقے بنے۔ ان کا اختلاف اظہار رائے کے دائرے میں رہا، اس سے آگے نہ جا سکا۔ مگر بعد کے زمانہ میں اسی رویت باری کے مسئلے پر زبردست معرکہ آرائیاں ہوئیں اور مسلمان مستقل طور پر دو فرقوں میں بٹ گئے۔ جن میں سے ایک معتزلہ کہلائے اور دوسرا وہ جس کو اہل سنت کہا جاتا ہے۔ اہل سنت نے اپنے اقتدار سے فائدہ اٹھا کر اگرچہ معتزلہ کو ختم کر دیا تاہم تاریخ اور درسیات میں ان کا غلغلہ ابھی تک جاری ہے۔

قرآن میں ایک آیت ہے کہ جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کر دے تو اس کی جزا جہنم ہے۔ وہ اس میں ہمیشہ رہے گا۔ اور اس پر اللہ کا غضب اور لعنت ہوگی (النساء ۹۳) اس آیت کی بنیاد پر حضرت عبد اللہ ابن عباس حضرت زید ابن ثابت اور حضرت عبد اللہ ابن مسعود کا خیال تھا کہ جو شخص بالارادہ کسی مومن کو قتل کر دے اس کی توبہ قبول نہیں ہوگی۔ سعید ابن جبیر تابعی کہتے ہیں کہ میں نے عبد اللہ ابن عباس سے پوچھا کہ جو شخص کسی مومن کو بالقصد قتل کر دے اس کی توبہ قبول ہوگی یا نہیں۔ عبد اللہ ابن عباس نے جواب دیا کہ نہیں۔ سعید ابن جبیر نے سورہ فرقان کی آیت نمبر ۶۸ ۔ ۷۰ سے استدلال کرتے ہوئے اس رائے سے اختلاف کیا۔ اس کے جواب میں حضرت عبد اللہ ابن عباس نے کہا، یہ آیت مکی ہے جس کو مدنی آیت نے منسوخ کر دیا۔

تاہم صحابہ کی اکثریت کا یہ خیال تھا کہ قاتل کے لئے بھی توبہ کی گنجائش ہے کیوں کہ قتل بہر حال

کفر سے زیادہ سخت جرم نہیں۔ پھر جب کفر معاف ہوسکتا ہے تو قتل کیوں نہیں معاف ہوسکتا۔ جب کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے، کہو جن لوگوں نے کفر کیا ہے اگر وہ باز آجائیں تو ان کا پچھلا سب کچھ معاف کر دیا جائے گا۔ (انفال ۳۷)

انسانوں کے درمیان اختلافات ہونا بالکل ناگزیر ہے۔ لوگ خواہ کتنے ہی صالح اور نیک نیت کیوں نہ ہوں، ان کے درمیان اختلافات ہوں گے۔ اختلافات کو ختم کرنا مطلوب نہیں ہے۔ البتہ جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ اختلافات کا اثر آدمی کے اخلاق اور برتاؤ پر نہ پڑے۔

صحابہ کے درمیان بہت سے بڑے بڑے اختلافات تھے جس کی چند مثال اوپر نظر آتی ہے۔ اس کے باوجود ان کے درمیان آپس میں کدورت پیدا نہیں ہوئی۔ مگر یہی وہ اختلافات تھے جن کی بنیاد پر بعد کے زمانہ میں ایسے فرقے بنے جو کبھی ختم نہ ہوسکے۔

ایک اختلاف اور دوسرے اختلاف میں اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرام زندہ لوگ تھے اور ان کے بعد ان کا نام لینے والے مردہ لوگ۔ صحابہ کرام کا ایمان شعوری ایمان تھا اور بعد کے لوگوں کا ایمان صرف وراثتی ایمان۔ صحابہ کرام اختلاف اور اتفاق کے حدود کو جانتے تھے۔ اور بعد کے لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ اختلاف کے حدود سے بھی ناواقف ہیں اور اتفاق کے حدود سے بھی ناواقف۔

ایک انسان اور دوسرے انسان میں مختلف اعتبار سے اتنا زیادہ فرق ہوتا ہے کہ ان کے درمیان اختلافات کا پیدا ہونا بالکل ناگزیر ہے۔ اب ایک طرف یہ مسئلہ ہے اور دوسری طرف یہ حقیقت ہے کہ موجودہ دنیا میں اجتماعیت ہی سب سے بڑی طاقت ہے۔ پھر اختلاف کے باوجود اجتماعی اتحاد کے مقصد کو کس طرح حاصل کیا جائے۔

اس کی ایک ہی قابل عمل صورت ہے۔ وہ یہ کہ ہر آدمی اختلاف کے باوجود متحد ہونے پر راضی ہوجائے۔ ہر آدمی شعوری طور پر یہ طے کرلے کہ وہ اختلاف کو صرف ذہنی اختلاف کے درجہ میں رکھے گا۔ اس کو عملی رکاوٹ یا قلبی بدمزگی تک نہیں جانے دے گا۔

یہ وہ اصول ہے جس پر ہر آدمی اپنے گھر اور خاندان کے اندر روزانہ رہتا ہے۔ اسی فطری اصول کو گھر سے باہر کی زندگی میں اختیار کرلینے کا نام اتحاد ہے۔ آدمی اپنے گھر کے نظم کو باقی رکھنا چاہتا ہے اس لئے وہ گھر کے اندر "اختلاف کے باوجود اتحاد" کے اصول پر کاربند رہتا ہے۔ یہی جذبہ گھر کے باہر کے لئے پیدا ہوجائے تو یہاں بھی وہ اختلاف کے باوجود اتحاد پر قائم رہے گا۔

اپنی غلطی

پروفیسر فریڈرش وان ہایک (پیدائش ۱۸۹۹) ایک برطانی مفکر ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب میں مغربی تہذیب کی ناکامی پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہم اپنی تہذیب کے موجودہ بحران کی تقریباً ہر توجیہہ قبول کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں، سوا ایک توجیہہ کے: یہ کہ دنیا کی موجودہ حالت خود ہماری اپنی واقعی غلطی کا نتیجہ ہو سکتی ہے اور یہ کہ اپنے کچھ بہت محبوب مقاصد کی طرف ہماری دوڑ نے بظاہر اس سے مختلف نتیجہ پیدا کیا ہے جس کی ہم اس سے امید کر رہے تھے:

> We are ready to accept almost any explanation of the present crisis of our civilisation except one: that the present state of the world may be the result of genuine error on our part, and that the pursuit of some of our most cherished ideals has apparently produced results different from those which we expected.
>
> Friedrich Von Hayek, *The Road to Serfdom*, London, 1944

یہ کمزوری جس کی طرف برطانی پروفیسر نے اشارہ کیا ہے، یہ اقوام عالم کی عام کمزوری ہے۔ اور خود موجودہ مسلمانوں میں یہ کمزوری بہت بڑے پیمانہ پر پائی جاتی ہے۔ (۲۴ جون ۱۹۸۴)

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے اپنے احیاء کے لئے بے شمار بہت بڑی بڑی تحریکیں چلائیں۔ یہ تمام تحریکیں پرشور ہنگاموں کے باوجود اپنے اصل مقصد میں سراسر ناکام رہیں۔ جب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ان "عظیم الشان تحریکوں" کی ناکامی کا سبب کیا ہے تو مسلمان ہمیشہ کچھ بیرونی دشمن یا خارجی اسباب پا لیتے ہیں، جن کو وہ اپنی ناکامی کا ذمہ دار قرار دے سکیں۔ یہ بات کسی طرح ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ خود ان کے قائدین کا غلط تجزیہ یا ناقص منصوبہ بندی ان کی ناکامیوں کا اصل سبب ہو سکتا ہے۔

کسی واقعہ کا سبب اگر اپنے اندر ہو اور اس کو آپ باہر ڈھونڈنے لگیں تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنے سر درد کے اسباب کو ہوا میں تلاش کرنے لگے۔

کامیابی اپنے ہاتھ میں

تھامس فلر کا قول ہے "پرندے اپنے پاؤں کے سبب سے جال میں پھنستے ہیں اور انسان اپنی زبان کے سبب سے"۔ انسان کی زبان اگرچہ بظاہر اس کے جسم کا بہت کمزور حصہ ہے مگر زندگی میں اس کا رول بے حد اہم ہے۔ زبان سے بولے ہوئے چند الفاظ آدمی کو مصیبت میں پھنسا دیتے ہیں اور زبان سے بولے ہوئے دوسرے قسم کے کچھ الفاظ اس کو مصیبت سے بچا لیتے ہیں۔

ایک شخص ایک کارخانہ میں کام کرتا تھا۔ کارخانہ کا مالک اس کو بہت مانتا تھا۔ وہ اس کی صلاحیتوں کا بہت قدر داں تھا۔ ایک بار کارخانہ میں پیسہ کی کمی پڑ گئی۔ مالک نے بڑی مشکل سے کارکنوں کی تنخواہیں دیں۔ تاہم اس نے مذکورہ شخص کی تنخواہ روک لی۔ کئی مہینے اسی طرح ہوا۔ اس "امتیازی سلوک" پر وہ شخص بگڑ گیا۔ ایک روز مالک سے مل کر اس کو سخت سخت باتیں سنائیں۔

یہ برہمی اس شخص کے حق میں الٹی ثابت ہوئی۔ مالک نے اس کو اپنا سمجھ کر ایسا کیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ پیسہ آنے پر وہ نہ صرف اس شخص کو پوری تنخواہ دے گا بلکہ اس میں اضافہ کر دے گا۔ مگر زبان کے غلط استعمال نے دونوں کے درمیان نفرت پیدا کر دی۔ محبت دشمنی میں تبدیل ہو گئی۔ مالک نے اس کی زبان درازی کی یہ سزا دی کہ اس کی تنخواہ مزید روک دی اور کارخانہ سے بھی اس کو نکال دیا۔ اس کے بعد کئی سالوں تک دونوں کے درمیان مقدمہ بازی ہوتی رہی۔ اگر وہ چپ رہتا تو وہ فائدہ میں رہتا مگر بول کر اس نے صرف نقصان اٹھایا۔

اس آدمی کو یہ غیر ضروری نقصان صرف اس لئے ہوا کہ وہ اپنی زبان پر قابو نہ رکھ سکا۔ ایک مغربی کہاوت ہے کہ "دو برائیوں میں سے چھوٹی برائی کو اپنے لئے پسند کرلو"۔ زندگی میں بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کامل برائی اور کامل بھلائی کے درمیان انتخاب کا موقع ہو۔ زیادہ تر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کو ایک برائی اور دوسری برائی کے درمیان انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ مذکورہ آدمی کے سامنے ایک طرف وقتی مسئلہ تھا اور دوسری طرف مستقل مسئلہ۔ اس نے وقتی مسئلہ کو برداشت نہیں کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو مستقل نقصان برداشت کرنے پر راضی ہونا پڑا۔

ایک ہندی شاعر نے کہا ہے "چوٹ سہے جو شبد کی وائے گرومیں داس" لفظ کی چوٹ میں نہ خون بہتا اور نہ پاؤں ٹوٹتا مگر آدمی کے لئے وہ لاٹھی اور بھالے سے بھی زیادہ سخت ہے۔ اکثر آدمیوں کا حال یہ ہے کہ وہ لفظ کی نفسیاتی چوٹ کو سہہ نہیں پاتے۔ اس لئے انھیں بڑے بڑے عملی نقصانات سہنے پڑتے ہیں۔

آدمی اگر لفظ کی چوٹ برداشت کرلے تو وہ نارمل حالت میں رہتا ہے، وہ اپنی حاضر دماغی کو نہیں کھوتا۔ اس بنا پر وہ اس پوزیشن میں رہتا ہے کہ وہ زیادہ بہتر طور پر اپنے مسئلہ کے حل کی تدبیر سوچ سکے۔ وہ لفظ کی چوٹ سہہ کر زیادہ کامیابی کے ساتھ وہ چیز حاصل کرلیتا ہے جس کو وہ لفظ کی چوٹ نہ سہہ کر حاصل کرنا چاہتا تھا مگر وہ حاصل نہ کرسکا۔

بوکر واشنگٹن امریکہ کا مشہور نیگرو گزرا ہے۔ ایک روز اس کو ایک ٹرین پکڑنی تھی۔ اس کو گھر سے نکلنے میں دیر ہوگئی وہ تیزی سے سڑک پر آیا تاکہ کسی سواری کے ذریعہ جلد از جلد اسٹیشن پہنچ سکے۔ وہ ایک گھوڑا گاڑی کے پاس آیا اور ڈرائیور سے کہا کہ میرے پاس وقت کم ہے تم مجھے فوراً اسٹیشن تک پہنچا دو ڈرائیور نے اس کی طرف دیکھا اور کہا کہ میں نے آج تک کسی کالے آدمی کے لئے اپنی گاڑی نہیں چلائی میں تم کو نہیں لے جا سکتا۔

بوکر واشنگٹن نے کہا: "ٹھیک ہے۔ تم پچھلی سیٹ پر چلے جاؤ، میں گاڑی چلانے کا کام کروں گا۔" یہ سن کر ڈرائیور حیرانی میں پڑ گیا۔ وہ خاموشی سے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بوکر واشنگٹن گھوڑے کو ہانکتا ہوا اسٹیشن لے گیا اور گاڑی پکڑ لی۔

زرتشت نے کہا ہے کہ "بھلائی کرنا فرض نہیں فائدہ ہے کیوں کہ بھلائی تمہارے سکھ میں اضافہ کرتی ہے" یہ ایک حقیقت ہے کہ بھلائی کر کے آدمی خود اپنے آپ کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ بوکر واشنگٹن اگر برے الفاظ کے جواب میں برے الفاظ بولتا تو وہ اپنے مسئلہ کو اور زیادہ مشکل بنا لیتا۔ کیوں کہ اس کے برے الفاظ گاڑی والے کو برہم کر دیتے اور وہ زیادہ شدت کے ساتھ اس کو اسٹیشن لے جانے سے انکار کر دیتا مگر بوکر واشنگٹن نے جب برے الفاظ کا جواب بھلے الفاظ سے دیا تو دوسرا آدمی بھی نرم پڑ گیا۔ پہلے اس کا دل جس خدمت کے لئے تیار نہ تھا اب اس نے اپنے آپ کو اس خدمت کے لئے آمادہ پایا۔

پاؤں ٹوٹنے کے بعد بھی

"جو آدمی ارادہ کر سکتا ہے اس کے لئے کچھ بھی ناممکن نہیں" ایمرسن کا یہ قول زندگی کی ایک بہت بڑی حقیقت کو بتاتا ہے وہ یہ کہ موجودہ دنیا میں انسان کے لئے امکانات اتنے زیادہ ہیں کہ وہ کبھی ختم نہیں ہوتے۔ اگر آدمی کے اندر سچے ارادہ کی طاقت ہو تو وہ ہر مشکل کو آسان کرے گا۔ راستے کی ہر رکاوٹ اس کے لئے اپنی منزل تک پہنچنے کا زینہ بن جائے گی۔

امکان کبھی ختم نہیں ہوتا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی مثالیں پوری انسانی تاریخ میں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہاں ہم ایک تازہ اور جیتی جاگتی مثال پیش کریں گے۔

سودھا چندرن جنوبی ہند کی ایک رقاصہ ہے۔ وہ سولہ سال کی تھی کہ ۲ مئی ۱۹۸۱ کو ایک حادثہ میں اس کا دایاں پاؤں ٹوٹ گیا۔ وہ فوری طور پر ایک مقامی اسپتال میں داخل کر دی گئی۔ وہاں ڈاکٹروں سے یہ غلطی ہوئی کہ اینٹی ٹٹنس انجکشن اور دوسری ضروری احتیاطوں کے بغیر اس کے پاؤں پر پلاسٹر باندھ دیا گیا۔ چند دن بعد تکلیف بڑھی تو اس کے والدین اس کو مدراس لے گئے اور ایک بڑے اسپتال میں داخل کیا وہاں ڈاکٹروں نے بتایا کہ اس کو ٹٹنس کا اثر ہوچکا ہے۔ کافی کوشش کے باوجود افاقہ نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ اس کا پاؤں پنڈلی کے نیچے سے کاٹ دیا گیا۔

کسی کا قول ہے "محبت ہر رکاوٹ کو دور کر دیتی ہے" یہ قول سودھا چندرن کے معاملہ میں لفظ بلفظ صحیح ثابت ہوا۔ اس کو رقص سے بے پناہ محبت تھی۔ پاؤں کٹنے کے بعد اس کا یہ حال ہوا کہ وہ روتی تھی اور کہتی تھی کہ میں تو رقص کرنا چاہتی ہوں، کیا میں دوبارہ رقص کر سکوں گی:

I want to dance. Will I dance again?

اس کے بعد اسپتال میں اس کے ساتھ بھی وہی کیا گیا جو ہر ایسے مریض کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس کا پاؤں پنڈلی کے پاس سے کاٹ دیا گیا اور اس کی جگہ جدید طرز کا مصنوعی پاؤں (جے پور فوٹ) لگا دیا گیا۔ ڈاکٹر پی کے سیٹھی (جنھوں نے جے پور فوٹ ایجاد کیا ہے) کی ملاقات سودھا چندرن کے استاد سے ہوئی۔ انھوں نے ڈاکٹر سیٹھی سے اپنے شاگرد کے شوق کا حال بتایا۔ انھوں نے جواب دیا کہ سودھا کے اندر اگر واقعۃً خواہش ہے تو وہ ایک عام آدمی کی طرح رقص کرنے کے قابل ہو جائے گی۔ اس کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ کچھ زیادہ محنت کرے اور ابتدائی تکلیف کو برداشت کرلے:

Sudha would be able to dance like any one with normal limbs. Only one had to be tough to put in the extra effort and bear initial pain.

یہاں دوبارہ سودھا چندرن کے لئے کسی مفکر کا یہ قول صحیح ثابت ہوا ـــــ "تکلیف ہماری خوشیوں کی قیمت ہے۔ جو شخص تکلیف کو برداشت کرلے وہ خوشی کو بھی ضرور پا کر رہے گا"

سودھا چندرن کو ڈاکٹر سیٹھی کی بات بتائی گئی تو وہ فوراً اس کے لئے تیار ہو گئی کہ وہ "ابتدائی تکلیف" کو برداشت کرے گی۔ اس نے کوشش شروع کر دی۔ وہ اپنے مصنوعی پاؤں پر مشق کرتی رہی یہاں تک کہ وہ دوبارہ کامل رقاصہ بن گئی۔

سودھا چندرن نے یکم اپریل ۱۹۸۴ کو بمبئی میں اپنے رقص کا مظاہرہ کیا۔ وہاں رقص کے ماہرین موجود تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ سودھا چندرن نے اتنا کامیاب رقص کیا کہ ان کے لئے یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ

اس کے دونوں پیروں میں سے کون سا پیر فطری ہے اور کون سا مصنوعی (نارد رن انڈیا پتریکا ۲۲ اپریل ۱۹۸۴) ——— رقص جیسے حقیر مقصد کے لئے ایک عورت نے اتنی غیر معمولی جدوجہد کی۔ پھر جو لوگ حق وصداقت جیسی برتر چیز کو اپنا مقصد بنائیں اس کے لئے ان کی جدوجہد تو اس سے بھی زیادہ ہونی چاہئے۔

"زیادہ دشواری کو حل کرنے کا سب سے زیادہ یقینی ذریعہ زیادہ محنت ہے" کسی کا یہ قول محض قول نہیں بلکہ زندگی کی ایک سادہ حقیقت ہے۔

جو شخص زندگی میں کسی رکاوٹ سے دوچار ہو جائے وہ بھی اسی طرح کامیاب زندگی حاصل کر سکتا ہے جیسے بے رکاوٹ والے لوگ حاصل کرتے ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ عام حالات سے کچھ زیادہ محنت کے لئے تیار ہو جائے اور ابتدائی مشقتوں کو برداشت کرلے۔

حالات سے مطابقت

ہر برٹ نکولس (Herbert L. Nicholas) نے لکھا ہے کہ میں نے کسی کتاب میں ایک بار ایک بوڑھے آدمی کا قصہ پڑھا جو ساری زندگی مسلسل سخت تکلیفوں میں مبتلا رہا۔ اس کے باوجود وہ ہمیشہ خوش اور مطمئن رہتا تھا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ تمہارے سکون واطمینان کا راز کیا ہے تو اس نے جواب دیا:

I learned to cooperate with the inevitable

میں نے ان چیزوں سے موافقت کرنا سیکھ لیا جن سے بچنا ممکن نہیں۔

زندگی میں بہت سی ایسی چیزیں پیش آتی ہیں جو ہمارے اختیار سے باہر ہوتی ہیں۔ ایسی چیزوں سے مقابلہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان سے مقابلہ نہ کیا جائے۔ اس طرح ہم غیر ضروری الجھن اور ذہنی تناؤ (Tension) سے بچ سکتے ہیں۔ یہ طریقہ ہم کو اس قابل بناتا ہے کہ ہم اپنی قوتوں کو وہاں خرچ کریں جہاں کوئی نتیجہ نکل سکتا ہے۔ اپنی قوتوں کو وہاں ضائع نہ کریں جہاں بالآخر وہ صرف بے نتیجہ ہو کر رہ جانے والی ہیں۔

یہی موجودہ دنیا میں زندگی کا اصول ہے۔ یہ اصول کسی ایک شخص کے لئے بھی کارآمد ہے اور پوری قوم کے لئے بھی۔

نوٹ: آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۱۵-۱۶ مئی ۱۹۸۴ کو نشر کیا گیا۔

ائمہ کے اقوال

مامنا الا من یخطئ و یرد علیہ الا المعصوم صلی اللہ علیہ وسلم (الامام مالک)

ہم میں سے ہر شخص غلطی کرتا ہے اور ہم میں سے ہر شخص کی کوئی بات قابل رد ہو سکتی ہے۔ سوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو کہ معصوم ہیں۔

اذا صح الحدیث فھو مذھبی۔ و اضربوا بقولی عرض الحائط (الامام الشافعی)

جب حدیث سے ثابت ہو جائے تو وہی میرا مسلک ہے۔ اس کے بعد میرے قول کو دیوار پہ مار دو۔

لاحجة فی قول احد دون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (الامام الشافعی)

رسول اللہ صلّے اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کا قول حجت نہیں۔

لا ینبغی لمن لا یعرف دلیلی ان یفتی بکلامی۔ (وکان اذا افتی یقول) ھذا رائ النعمان بن ثابت وھو احسن ما قدرنا علیہ فمن جاء باحسن منہ فھو اولیٰ بالصواب (الامام ابوحنیفہ)

جو شخص میری دلیل کو نہ جانے اس کے لئے درست نہیں کہ وہ ہمارے قول پر فتویٰ دے۔ ابوحنیفہ جب کسی مسئلہ میں فتویٰ دیتے تو کہتے کہ یہ نعمان بن ثابت کی رائے ہے۔ ہمارے علم کے مطابق یہ احسن ہے۔ جو شخص اس سے زیادہ احسن کو پائے تو اس کے بعد وہی زیادہ احسن ہے۔

لا تقلدنی ولا تقلد مالکا ولا الشافعی ولا الاوزاعی ولا النخعی ولا غیرھم (الامام احمد بن حنبل)

تم میری تقلید نہ کرو اور نہ مالک اور شافعی اور اوزاعی اور نخعی یا کسی اور کی تقلید کرو۔

منار الاسلام صفر ۱۴۰۴ھ (نومبر۔دسمبر ۱۹۸۳)

ائمہ اربعہ کے ان اقوال سے ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک اصل چیز قرآن اور سنت تھی۔ وہ اس کو سراسر غلط سمجھتے تھے کہ کوئی شخص ان کا مقلد بن جائے اور کتاب و سنت سے براہ راست دین اخذ نہ کرے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بعد کے دور میں جو تقلید رائج ہوئی اس کا خود ائمہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔

موجودہ رواجی تقلید کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ قرآن و سنت کے ساتھ آدمی کا زندہ رشتہ قائم نہیں رہتا۔ قرآن و سنت مومن کی غذائیں ہیں۔ مگر مروجہ تقلید کے بعد قرآن و سنت یا تو کسی تقلیدی مسلک کو صحیح ثابت کرنے کے لئے استعمال ہوتے ہیں یا برکت اور تقدس حاصل کرنے کے لئے۔ قرآن و سنت کے نام پر آدمی قرآن و سنت سے دور ہو جاتا ہے۔

الفاظ کا فتنہ

ابو الطیب احمد بن حسین عرف متنبی (۲۵۴-۳۰۲ھ) کے متعلق دو رائیں ہیں۔ ایک طبقہ کا کہنا ہے کہ اس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ اور اس بنا پر امیر حمص نے اس کو قید خانہ میں بند کر دیا تھا۔ دوسرا طبقہ اس کا منکر ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ممکن ہے کہ متنبی کے دل میں کبھی اس کا ارادہ پیدا ہو مگر اس نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا۔

متنبی ایک ذہین اور باکمال شاعر تھا۔ اس کا کچھ کلام کتابوں میں نقل ہوا ہے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے قرآن کے جواب میں کہا تھا مثلاً :

النجم السیار والفلک الدوار واللیل والنہار
ان الکافر لفی اخطار

جو لوگ عربی زبان سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ کلام اتنا سطحی ہے کہ کوئی جاہل یا غبی آدمی ہی اس کو قرآن کے مقابلہ میں رکھ سکتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ متنبی سے پوچھا گیا کہ تم محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں کیا کہتے ہو۔ کیوں کہ آپ نے تو صاف طور پر کہا ہے کہ لا نبی بعدی (میرے بعد کوئی نبی نہیں) اس نے کہا کہ تم لوگوں نے اس حدیث کا مطلب نہیں سمجھا۔ اس حدیث میں تو میری نبوت کی بشارت ہے۔ اس میں لا حرف نفی نہیں ہے بلکہ یہ نام ہے، حدیث کا مطلب یہ ہے کہ "لا" نام کا نبی میرے بعد ہوگا۔ کیوں کہ آسمانوں پر میرا نام "لا" ہے۔

ایک برطانی شہری کو کسٹم والوں نے پکڑا۔ وہ اپنے جوتے میں ۵۹۸ ملی گرام ہیروئن لیے ہوئے تھا (ٹائمس آف انڈیا ۱۹ جون ۱۹۸۴) سوالات کے دوران اس نے کہا کہ اس نے صرف اس لئے ایسا کیا تھا کہ اپنی عادت کو ٹھوکر مار کر پھینک دے۔

He was only trying to kick the habit.

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ لفظی تاویل کا میدان کتنا زیادہ وسیع ہے۔ لفظی تاویل ایک ایسا ہتھیار ہے جو سفید کو سیاہ کر دے۔ جو قائل کے کلام سے اس کے منشا کے برعکس مفہوم ثابت کر دے۔ لفظی تاویل آدمی کو یہ موقع دیتی ہے کہ وہ ہر بات سے اپنا نظریہ نکال لے۔ خواہ وہ بات اصلاً اس کے نظریہ کے بالکل برعکس مفہوم کیوں نہ رکھتی ہو۔ آدمی حقیقت کی تردید الفاظ کے ذریعہ کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ خدا کی دنیا میں ایسا ہونا کبھی ممکن نہیں۔

اسلامی انقلاب

حضرت آدم پہلے انسان تھے اور اسی کے ساتھ پہلے پیغمبر بھی۔ بعض روایات کے مطابق حضرت آدم کے بعد تقریباً ایک ہزار سال تک آپ کی نسل توحید اور دین حق پر قائم رہی۔ اس کے بعد ملّتِ آدم میں شرک کا غلبہ ہوگیا (البقرہ ۲۱۳) حضرت نوح اسی ملّت آدم کی اصلاح کے لئے آئے جو اس وقت دجلہ اور فرات کے سرسبز علاقہ میں آباد تھی۔

تاہم حضرت نوح کی طویل کوششوں کے باوجود ملّت آدم دوبارہ مشرکانہ دین کو چھوڑنے کے لئے تیّار نہ ہوئی۔ ان میں سے صرف چند آدمی تھے جو حضرت نوح پر ایمان لائے۔ چنانچہ عظیم طوفان آیا اور چند مومنین کو چھوڑکر باقی تمام لوگ غرق کر دئے گئے۔ اس کے بعد ملّت نوح کے ذریعہ دوبارہ انسانی نسل چلی۔ لیکن دوبارہ وہی قصہ پیش آیا جو اس سے پہلے پیش آچکا تھا۔ کچھ عرصہ بعد بیشتر لوگ دین توحید کو چھوڑ کر دین شرک پر چل پڑے۔ یہی قصہ ہزاروں سال تک بار بار پیش آتا رہا۔ خدا نے لگاتار پیغمبر بھیجے (المومنون ۴۴) مگر انسان ان سے نصیحت قبول کرنے پر تیار نہ ہوا۔ حتی کہ تمام پیغمبروں کو استہزار کا موضوع بنالیا گیا (لیسین ۳۰)

یہ سلسلہ ہزاروں برس تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ تاریخ میں شرک کا تسلسل قائم ہوگیا۔ اس زمانہ کے انسانی معاشروں میں جو شخص بھی پیدا ہوتا وہ اپنے ماحول کی ہر چیز سے شرک کا سبق لیتا۔ مذہبی رسموں، سماجی تقریبات قومی میلے اور حکومتی نظام تک ہر چیز مشرکانہ عقائد پر قائم ہوگئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جو انسان بھی پیدا ہو وہ شرک کی فضا میں آنکھ کھولے اور شرک ہی کے ماحول میں اس کا خاتمہ ہو جائے۔ اسی چیز کو میں نے تاریخ میں شرک کا تسلسل قائم ہو جانے سے تعبیر کیا ہے، اور یہی وہ حقیقت ہے جو حضرت نوح کی دعا میں ان الفاظ میں ملتی ہے: ولا یلدوا الا فاجراً کفاراً (نوح ۲۷)

اب تاریخ حضرت ابراہیم تک پہنچ چکی تھی جن کا زمانہ ۲۱۰۰ قبل مسیح ہے۔ خود حضرت ابراہیم نے قدیم عراق میں جو اصلاحی کوششیں کیں ان کا بھی وہی انجام ہوا جو آپ سے پہلے دوسرے نبیوں کا ہوا تھا۔ اس وقت اللہ تعالٰی نے انسان کی ہدایت کے لئے نیا منصوبہ بنایا۔ وہ منصوبہ یہ تھا کہ خصوصی اہتمام کے ذریعہ ایک ایسی نسل تیار کی جائے جو شرک کے تسلسل سے منقطع ہوکر پرورش پائے۔ اپنی فطری حالت پر قائم رہنے کی وجہ سے اس کے لئے توحید کو قبول کرنا آسان ہو جائے۔ پھر اسی گروہ کو اس مقصد کے لئے استعمال کیا جائے کہ وہ تاریخ میں جاری ہونے والے شرک کے تسلسل کو توڑے۔

اس وقت حضرت ابراہیم کو حکم ہوا کہ وہ عراق اور شام اور مصر اور فلسطین جیسے آباد علاقوں کو چھوڑ کر

قدیم مکہ کے غیر آباد علاقہ میں جائیں۔ اور وہاں اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے شیر خوار بچے اسماعیل کو بسادیں۔ یہ علاقہ وادی غیر ذی زرع ہونے کی وجہ سے اس زمانہ میں بالکل غیر آباد تھا۔ اس بنا پر وہ قدیم مشرکانہ تہذیب سے پوری طرح پاک تھا۔ حضرت ابراہیم کی دعا (ابراہیم ۳۷)میں عند بیتک المحرم سے یہی چیز مراد ہے۔ یعنی ایک ایسا مقام جو شرک کی پہنچ سے دور ہو۔ حضرت ابراہیم کی اس دعا کا مطلب یہ تھا کہ خدایا ، میں نے اپنی اولاد کو ایک بالکل غیر آباد علاقہ میں بسادیا ہے۔ جہاں مشرکانہ تہذیبوں کے اثرات ابھی تک نہیں پہنچے ہیں۔ ایسا میں نے اس لئے کیا ہے تاکہ وہاں ایک ایسی نسل پیدا ہو جو شرک کے تسلسل سے منقطع ہو کر پرورش پائے اور حقیقی معنوں میں توحید کی پرستار بن سکے۔

کسی تہذیبی تسلسل سے منقطع ہو کر پرورش پانا کیا معنی رکھتا ہے ، اس کی وضاحت ایک جزئی مثال سے ہوتی ہے ، راقم الحروف ایک ایسے علاقہ کا رہنے والا ہے جس کی زبان اردو ہے۔ میرے باپ اردو بولتے تھے۔ میں بھی اردو بولتا ہوں اور میرے بچوں کی زبان بھی اردو ہے۔ اب یہ ہوا کہ میرے ایک لڑکے نے لندن میں ایک ایسے علاقہ میں رہائش اختیار کرلی جہاں صرف انگریزی بولنے والے لوگ رہتے ہیں اور ہر طرف انگریزی زبان کا ماحول ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے اس لڑکے کے بچے اب صرف انگریزی زبان جانتے ہیں۔ وہ اردو میں اظہار خیال کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ میں لندن گیا تو اپنے ان پوتوں سے مجھے انگریزی زبان میں بات کرنی پڑی۔

میرے ان پوتوں کا یہ حال اس لئے ہوا کہ اردو کے تسلسل سے منقطع ہو کر ان کی پرورش ہوئی۔ اگر وہ میرے ساتھ دہلی میں ہوتے تو ان بچوں کا یہ معاملہ کبھی نہ ہوتا۔

ذبح اسماعیل کے واقعہ کی حقیقت بھی یہی ہے۔ حضرت ابراہیم کو جو خواب (الصافات ۱۰۲) دکھایا گیا وہ ایک تمثیلی خواب تھا۔ اگرچہ حضرت ابراہیم اپنی انتہائی وفاداری کی بنا پر اس کی حقیقی تعمیل کے لئے آمادہ ہو گئے۔ قدیم مکہ میں نہ پانی تھا ، نہ سبزہ اور نہ زندگی کا کوئی سامان۔ ایسی حالت میں اپنی اولاد کو وہاں بسانا یقیناً ان کو ذبح کرنے کے ہم معنی تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان کو جیتے جی موت کے حوالے کر دیا جائے۔ شرک کے تسلسل سے منقطع کر کے نئی نسل پیدا کرنے کا منصوبہ کسی ایسے مقام پر ہی زیر عمل لایا جاسکتا تھا جہاں اسباب حیات نہ ہوں اور اس بنا پر وہ انسانی آبادی سے خالی ہو حضرت ابراہیم کے خواب کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی اولاد کو معاشی اور سماجی حیثیت سے ذبح کر کے مذکورہ نسل تیار کرنے میں خدائی منصوبہ کا ساتھ دیں۔

یہ منصوبہ چونکہ اسباب کے دائرہ میں زیر عمل لانا تھا اس لئے اس کی باقاعدہ نگرانی بھی ہوتی رہی۔

حضرت ابراہیم خود فلسطین میں مقیم تھے۔ مگر وہ کبھی کبھی اس کی جانچ کے لئے مکہ جاتے رہتے تھے۔

ابتداءً اس مقام پر صرف ہاجرہ اور اسماعیل تھے۔ بعد کو جب وہاں زمزم کا پانی نکل آیا تو قبیلہ جرہم کے کچھ خانہ بدوش افراد یہاں آکر آباد ہو گئے۔ حضرت اسماعیل بڑے ہوئے تو انھوں نے قبیلہ جرہم کی ایک لڑکی سے شادی کر لی۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت ابراہیم ایک بار فلسطین سے چل کر مکہ پہنچے تو اس وقت حضرت اسماعیل گھر پر موجود نہ تھے۔ حضرت ابراہیم نے ان کی بیوی سے حال دریافت کیا۔ بیوی نے کہا کہ ہم بہت برے حال میں ہیں، اور زندگی مصیبتوں میں گزر رہی ہے۔ حضرت ابراہیم یہ کہہ کر واپس ہو گئے کہ جب اسماعیل آئیں تو ان کو میرا سلام کہنا اور یہ کہنا کہ اپنے دروازہ کی چوکھٹ بدل دو (غیّر عتبة بابك) حضرت اسماعیل جب لوٹے اور بیوی سے یہ روداد سنی تو وہ سمجھ گئے کہ یہ میرے والد تھے اور ان کا پیغام تمثیل کی زبان میں یہ ہے کہ میں موجودہ عورت کو چھوڑ کر دوسری عورت سے رشتہ کر لوں۔ چنانچہ انھوں نے اس کو طلاق دے دی اور قبیلہ کی دوسری عورت سے شادی کر لی۔ حضرت ابراہیم کی نظر میں وہ عورت اس قابل نہ تھی کہ وہ زیر تیاری نسل کی ماں بن سکے۔

کچھ عرصہ بعد حضرت ابراہیم دوبارہ مکہ آئے۔ اب بھی حضرت اسماعیل گھر پر نہ تھے۔ البتہ ان کی دوسری بیوی وہاں موجود تھیں۔ اس سے حال پوچھا تو اس نے قناعت اور شکر کی باتیں کیں اور کہا کہ ہم بہت اچھے حال میں ہیں۔ حضرت ابراہیم یہ کہہ کر واپس ہو گئے کہ جب اسماعیل آئیں تو ان سے میرا سلام کہنا اور یہ پیغام دے دینا کہ اپنے گھر کی چوکھٹ باقی رکھو (ثبت عتبة بابك) حضرت اسماعیل جب واپس آئے اور روداد سنی تو سمجھ گئے کہ یہ میرے والد تھے اور ان کے پیغام کا مطلب یہ ہے کہ اس عورت کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ وہ پیش نظر منصوبہ سے مطابقت کر کے رہ سکے اور پھر اس سے وہ نسل تیار ہو جس کا یہاں تیار کرنا اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے (تفسیر ابن کثیر)

اس طرح صحرائے عرب کے الگ تھلگ ماحول میں ایک نسل بننا شروع ہوئی۔ اس نسل کی خصوصیات کیا تھیں، اس کے متعلق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ نسل بیک وقت دو خصوصیات کی حامل تھی۔ ایک الفطرۃ اور دوسرے المروۃ۔

صحرائے عرب کے ماحول میں فطرت کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی جو انسان کو متاثر کرے۔ کھلے بیابان، اونچے پہاڑ، رات کے وقت وسیع آسمان میں جگمگاتے ہوئے تارے وغیرہ۔ اس قسم کے قدرتی مناظر چاروں طرف سے انسان کو توحید کا سبق دے رہے تھے۔ وہ ہر وقت اس کو خدا کی عظمت اور کاریگری کی یاد دلاتے تھے۔ اسی خالص ربانی ماحول میں پرورش پا کر وہ قوم تیار ہوئی جو حضرت ابراہیم

کے الفاظ میں اس بات کی صلاحیت رکھتی تھی کہ وہ حقیقی معنوں میں امت مسلمہ (البقرہ ۱۲۸) بن سکے۔ یعنی اپنے آپ کو پوری طرح خدا کے سپرد کر دینے والی قوم۔ یہ ایک ایسی قوم تھی جس کی فطرت اپنی ابتدائی حالت میں محفوظ تھی، اسی لئے وہ دین فطرت کو قبول کرنے کی پوری استعداد رکھتی تھی۔

اسی کے ساتھ دوسری چیز جس کو پیدا کرنے کے لئے یہ ماحول خصوصی طور پر موزوں تھا وہ وہی ہے جس کو عربی زبان میں المروۃ (مردانگی) کہتے ہیں۔ قدیم حجاز کے سنگلاخ ماحول میں زندگی نہایت مشکل تھی۔ وہاں خارجی اسباب سے زیادہ انسانی اوصاف کار آمد ہو سکتے تھے۔ وہاں بیرونی ماحول میں وہ چیزیں موجود نہ تھیں جن پر انسان بھروسہ کرتا ہے۔ وہاں انسان کے پاس ایک ہی چیز تھی، اور وہ اس کا اپنا وجود تھا۔ ایسے ماحول میں قدرتی طور پر ایسا ہونا تھا کہ انسان کے اندرونی اوصاف زیادہ سے زیادہ اجاگر ہوں۔ اس طرح دو ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں وہ قوم بن کر تیار ہوئی جس کے اندر حیرت انگیز طور پر اعلیٰ مردانہ اوصاف تھے۔ پروفیسر فلپ ہٹی کے الفاظ میں پورا عرب ہیروؤں کی ایک ایسی نرسری (Nursery of heroes) میں تبدیل ہو گیا جس کی مثال نہ اس سے پہلے تاریخ میں کبھی پائی گئی اور نہ اس کے بعد۔

چھٹی صدی عیسوی میں وہ وقت آگیا تھا کہ تاریخ میں شرک کے تسلسل کو توڑنے کا منصوبہ تکمیل تک پہنچایا جائے۔ چنانچہ بنو اسماعیل کے اندر پیغمبر آخر الزماں (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پیدا کر دیے گئے، جن کے بارہ میں قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں: ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون (الصف) یہ آیت بتاتی ہے کہ پیغمبر آخر الزماں کا خاص مشن یہ تھا کہ دین شرک کو غلبہ کے مقام سے ہٹا دیں اور دین توحید کو غالب دین کی حیثیت سے دنیا میں قائم کر دیں۔ اس غلبہ سے مراد اصلاً فکری اور نظریاتی غلبہ ہے۔ یعنی تقریباً اسی قسم کا غلبہ جیسا کہ موجودہ زمانہ میں سائنسی علوم کو روایتی علوم کے اوپر حاصل ہوا ہے۔

یہ غلبہ تاریخ کا مشکل ترین منصوبہ تھا۔ اس کا کچھ اندازہ اس مثال سے ہو سکتا ہے کہ قدیم روایتی علوم کو اگر جدید سائنسی علوم پر غالب کرنے کی مہم چلائی جائے تو وہ کس قدر دشوار ہو گی۔ اسی طرح ساتویں صدی عیسوی میں یہ بے حد مشکل کام تھا کہ مشرکانہ تہذیب کو مغلوب کیا جائے اور اس کی جگہ توحید کو غالب فکر کا مقام عطا کیا جائے۔ کسی نظام کے فکری غلبہ کو ختم کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی درخت کو اس کی تمام جڑوں سمیت اکھاڑ پھینکنا۔ اس قسم کا کام ہمیشہ بے حد مشکل کام ہوتا ہے جو نہایت گہری منصوبہ بندی اور زبردست جدوجہد کے بعد ہی انجام دیا جا سکتا ہے۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے پیغمبر آخر الزماں صلے اللہ علیہ وسلم کو دو خاص امدادی چیزیں فراہم کی گئیں۔ ایک وہ جس کا ذکر کنتم خیر امۃ اخرجت للناس (آل عمران ۱۱۰) میں ہے۔ دو ہزار سال کے عمل کے نتیجہ میں ایک ایسا گروہ تیار کیا گیا جو وقت کا بہترین گروہ تھا۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، ایک طرف وہ اپنی تخلیقی فطرت پر قائم تھا۔ دوسری طرف وہ چیز اس کے اندر کمال درجہ میں موجود تھی جس کو عربی زبان میں المروۃ (مردانگی) کہا جاتا ہے۔ اسی گروہ کے بہترین منتخب افراد، قبول اسلام کے بعد وہ لوگ بنے جن کو اصحاب رسول کہا جاتا ہے۔

دوسری خصوصی مدد وہ تھی جس کی طرف سورہ الروم کی ابتدائی آیات میں اشارہ ملتا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت دنیا میں دو بڑی مشرکانہ سلطنتیں تھیں۔ ایک رومی (بازنطینی) سلطنت، دوسرے ایرانی (ساسانی) سلطنت۔ اس وقت کی آباد دنیا کا اکثر حصہ، براہ راست یا بالواسطہ طور پر، انھیں دونوں سلطنتوں کے زیر قبضہ تھا۔ توحید کو وسیع تر دنیا میں غالب کرنے کے لیے ان دونوں مشرک سلطنتوں سے سابقہ پیش آنا لازمی تھا۔ خدا نے یہ کیا کہ عین اسی زمانہ میں دونوں سلطنتوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا دیا۔ ان کی یہ لڑائی نسلوں تک جاری رہی۔ ایک بار ایرانی اٹھے اور رومیوں کی طاقت کو تہس نہس کر کے ان کی مملکت کے بڑے حصہ پر قابض ہو گئے۔ دوسری بار رومی اٹھے اور انھوں نے ایرانیوں کی طاقت کو بالکل توڑ ڈالا۔ یہی وجہ ہے کہ بنو اسماعیل (اصحاب رسول) جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے تحت منظم ہو کر اٹھے تو انھوں نے بے حد کم عرصہ میں ایشیا اور افریقہ کے بڑے حصہ کو فتح کر ڈالا اور ہر طرف شرک کو مغلوب اور توحید کو غالب کر دیا۔

اس سلسلے میں یہاں پروفیسر ہٹی کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے:

> The enfeebled condition of the rival Byzantines and Sasanids who had conducted internecine against each other for many generations, the heavy taxes, consequent upon these wars, imposed on the citizens of both empires and undermining their sense of loyalty., ------- all these paved the way for the surprisingly rapid progress of Arabian arms.
>
> Philip K. Hitti, *History of the Arabs,* London 1970, p. 142–43

رومی اور ایرانی سلطنتوں کی باہمی رقابت نے دونوں کو شدید طور پر کمزور کر دیا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف ہلاکت خیز جنگیں چھیڑ رکھی تھیں۔ یہ سلسلہ کئی نسل تک جاری رہا۔ اس کا خرچ پورا کرنے کے لئے رعایا پر بھاری ٹیکس لگائے گئے۔ جس کے نتیجے میں رعایا کی وفاداری اپنی حکومتوں کے ساتھ باقی نہ رہی۔ اس قسم کی چیزیں تھیں جنھوں نے عرب ہتھیاروں کو موقع دیا کہ وہ رومی اور

ایرانی علاقوں میں تعجب خیز حد تک تیز کامیابی حاصل کر سکیں۔

مورخین نے عام طور پر اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ تاہم وہ اس کو ایک عام طبیعی واقعہ سمجھتے ہیں حالانکہ یہ غیر معمولی واقعہ ایک خدائی منصوبہ تھا جو خاتم النبیین کی تائید کے لئے خصوصی طور پر ظاہر کیا گیا۔

ایک امریکی انسائیکلوپیڈیا میں "اسلام" کے عنوان سے جو مقالہ ہے اس میں عیسائی مقالہ نگار نے یہ الفاظ لکھے ہیں کہ اسلام کے ظہور نے انسانی تاریخ کے رخ کو بدل دیا:

Its advent changed the course of human history.

یہ ایک حقیقت ہے کہ صدر اول کے اسلامی انقلاب کے بعد انسانی تاریخ میں ایسی تبدیلیاں ہوئیں جو اس سے پہلے تاریخ میں کبھی نہیں ہوئی تھیں۔ اور ان تمام تبدیلیوں کی اصل یہ تھی کہ دنیا میں شرک کا تسلسل ختم ہو کر توحید کا تسلسل جاری ہوا۔ شرک تمام برائیوں کی جڑ ہے اور توحید تمام خوبیوں کا سرچشمہ ہے۔ اس لئے جب یہ بنیادی واقعہ ہوا تو اسی کے ساتھ انسان کے اوپر تمام خوبیوں کا دروازہ بھی کھل گیا جو شرک کے غلبہ کے سبب سے اب تک اس کے اوپر بند پڑا ہوا تھا۔

اب توہماتی دور ختم ہو کر علمی دور کا آغاز ہوا۔ انسانی امتیاز کی بنیاد ڈھ گئی اور اس کے بجائے انسانی مساوات کا زمانہ شروع ہوا۔ نسلی حکمرانی کی جگہ جمہوری حکمرانی کی بنیادیں پڑیں۔ مظاہر فطرت جو تمام دنیا میں پرستش کا موضوع بنے ہوئے تھے، پہلی بار تحقیق اور تسخیر کا موضوع قرار پائے، اور اس طرح حقائق فطرت کے کھلنے کا آغاز ہوا۔ یہ دراصل توحید ہی کا انقلاب تھا جس سے ان تمام انقلابات کی بنیاد پڑی جو بالآخر اس مشہور واقعہ کو پیدا کرنے کا سبب بنے جس کو جدید ترقی یافتہ دور کہا جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم نے دعا فرمائی تھی کہ خدایا مجھ کو اور میری اولاد کو اس سے بچا کہ ہم بتوں کی عبادت کریں۔ خدایا، ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا (ابراہیم ۳۶)

سوال یہ ہے کہ بتوں نے کس طرح لوگوں کو گمراہ کیا۔ بتوں (اصنام) میں وہ کون سی خصوصیت تھی جس کی بنا پر وہ لوگوں کو گمراہ کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اس کا راز اس وقت سمجھ میں آتا ہے جب یہ دیکھا جائے کہ حضرت ابراہیم کے زمانہ میں وہ کون سے بت تھے جن کی بابت آپ نے یہ الفاظ فرمائے۔

یہ بت سورج، چاند اور ستارے تھے۔ تاریخی طور پر ثابت ہے کہ حضرت ابراہیم کے زمانہ میں جو مہذب دنیا تھی اس میں ہر جگہ آسمان کے ان روشن اجرام کی پرستش ہوتی تھی جن کو سورج، چاند اور ستارے کہا جاتا ہے۔ اسی سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ بت کیوں کر لوگوں کو گمراہ کر پاتے تھے۔

خدا اگرچہ سب سے بڑی حقیقت ہے مگر وہ آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا۔ اس کے برعکس

سورج، چاند اور ستارے ہر آنکھ کو جگمگاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی جگمگاہٹ کی بنا پر لوگ ان کے فریب میں آگئے اور ان سے متاثر ہو کر ان کو پوجنا شروع کر دیا۔ ان روشن اجسام کا غلبہ انسان کے ذہن پر اتنا زیادہ ہوا کہ وہی پوری انسانی فکر پر چھا گیا۔ حتیٰ کہ حکومتیں بھی انھیں کی بنیاد پر قائم ہونے لگیں۔ اس زمانہ کے بادشاہ اپنے آپ کو سورج کی اولاد اور چاند کی اولاد بتا کر لوگوں کے اوپر حکومت کرنے لگے۔

پیغمبر آخر الزماں کے ذریعہ توحید کو غالب کر کے اس دور کو ختم کیا گیا۔ اس وقت غلبۂ توحید کا جو منصوبہ بنایا گیا اس کے دو خاص مرحلے تھے۔ پہلا مرحلہ وہ تھا جس کو قرآن میں قاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ و یکون الدین کلہ للہ (الانفال ۳۹) کہا گیا ہے۔ اس آیت میں "فتنہ" سے مراد شرک جارح ہے۔ قدیم زمانہ میں شرک کو جارحیت کا موقع اس لئے حاصل تھا کہ اس زمانہ میں حکومت کی بنیاد شرک پر قائم ہوگئی تھی۔ شرک کو مکمل طور پر حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔ ایسی حالت میں جب توحید کی دعوت دی جاتی تو وقت کے حکمرانوں کو یہ محسوس ہونے لگتا کہ یہ دعوت ان کے حق حکمرانی کو مشتبہ کر رہی ہے۔ چنانچہ وہ توحید کے داعیوں کو کچلنے کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ قدیم زمانہ میں اعتقادی جارحیت کا اصل سبب یہی تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو یہ حکم ہوا کہ علم برداران شرک سے لڑو اور شرک کی اس حیثیت کا خاتمہ کر دو کہ وہ داعیان توحید کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنا سکیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ تھا کہ شرک کا رشتہ سیاست سے کاٹ دیا جائے۔ شرک اور سیاست دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔ رسول اور آپ کے اصحاب نے یہ مہم پوری طاقت کے ساتھ شروع کی۔ ان کی کوششوں سے پہلے عرب میں شرک کا زور ٹوٹا۔ اس کے بعد قدیم آباد دنیا کے بیشتر علاقہ میں مشرکانہ نظام کو مغلوب کر کے ہمیشہ کے لئے شرک کی جارحانہ حیثیت کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اب ہمیشہ کے لئے شرک الگ ہو گیا اور سیاسی اقتدار الگ۔

شرک کے اوپر توحید کے غلبہ کی مہم کا دوسرا مرحلہ وہ تھا جس کا ذکر قرآن کی اس آیت میں ملتا ہے: سنریھم آیاتنا فی الآفاق و فی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق (حم السجدہ ۵۳) پہلے مرحلہ کا مطلب مظاہر فطرت سے سیاسی نظریہ اخذ کرنے کو ختم کرنا تھا۔ وہ ساتویں صدی عیسوی میں پوری طرح انجام پا گیا۔ دوسرے مرحلہ کا مطلب یہ تھا کہ مظاہر فطرت سے توہمات کے پردہ کو ہٹا دیا جائے اور اس کو علم کی روشنی میں لایا جائے۔ اس دوسرے مرحلہ کا آغاز دور نبوت سے ہوا اور اس کے بعد وہ موجودہ سائنسی انقلاب کی صورت میں تکمیل کو پہنچا۔

موجودہ دنیا خدا کی صفات کا ایک اظہار ہے۔ یہاں مخلوقات کے آئینہ میں آدمی اس کے

خالق کو پاتا ہے۔ وہ اس پر غور کرکے خدا کی قدرت اور عظمت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ مگر قدیم مشرکانہ افکار نے دنیا کی چیزوں کو پر اسرار طور پر مقدس بنا رکھا تھا۔ ہر چیز کے بارہ میں کچھ توہماتی عقائد بن گئے تھے اور یہ عقائد ان چیزوں کی تحقیق وجستجو میں مانع تھے۔ توحید کے انقلاب کے بعد جب تمام دنیا خدا کی مخلوق قرار پائی تو اس کے بارہ میں تقدس کا ذہن ختم ہوگیا۔ اب دنیا کی ہر چیز کا بے لاگ مطالعہ کیا جانے لگا اور اس کی تحقیق شروع ہوگئی۔

اس تحقیق اور مطالعہ کے نتیجہ میں چیزوں کی حقیقتیں کھلنے لگیں۔ دنیا کے اندر قدرت کا جو مخفی نظام کارفرما ہے وہ انسان کے سامنے آنے لگا۔ یہاں تک کہ جدید سائنسی انقلاب کی صورت میں وہ پیشین گوئی کامل صورت میں پوری ہوگئی جس کا ذکر اوپر کی آیت (حم السجدہ ۵۳) میں ہے۔

جدید سائنسی مطالعہ نے کائنات کے جو حقائق انسان پر کھولے ہیں انھوں نے ہمیشہ کے لئے توہماتی دور کا خاتمہ کردیا ہے۔ ان دریافت شدہ حقائق سے بیک وقت دو فائدے حاصل ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ دینی عقائد اب محض مدعیانہ عقائد نہیں رہے بلکہ خود علم انسانی کے ذریعہ ان کا برحق ہونا ایک ثابت شدہ چیز بن گیا ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ معلومات ایک مومن کے لئے اضافۂ ایمان کا بے پناہ خزانہ ہیں۔ ان کے ذریعہ کائنات کے بارہ میں جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ اگرچہ بہت جزئی ہے تاہم وہ اتنا زیادہ حیرت ناک ہے کہ اس کو پڑھ کر اور جان کر آدمی کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوں۔ اس کا ذہن معرفت رب کی روشنی حاصل کرے۔ اس کی آنکھیں خدا کی عظمت اور خوف سے آنسو بہانے لگیں۔ وہ آدمی کو اس درجۂ احسان تک پہنچادے جس کو حدیث میں تعبد اللہ کانک تراہ (اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو) کہا گیا ہے۔

دور جدید میں احیاء اسلام

موجودہ زمانہ میں تاریخ دوبارہ وہیں پہنچ گئی ہے جہاں وہ ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے دور میں پہنچی تھی۔ قدیم زمانہ میں انسان کے اوپر شرک کا غلبہ اس طرح ہوا کہ تاریخ میں اس کا تسلسل قائم ہوگیا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہر شخص جو انسانی نسل میں پیدا ہوتا وہ مشرک پیدا ہوتا۔ اب پچھلے چند سو سال کے عمل کے نتیجہ میں ملحدانہ افکار انسان کے اوپر غالب آگئے ہیں۔ علم وعمل کے ہر شعبہ میں الحادی طرز فکر اس طرح چھا گیا ہے کہ دوبارہ تاریخ انسانی میں الحاد کا تسلسل قائم ہوگیا ہے۔ اب ہر شخص جو پیدا ہوتا ہے، خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں پیدا ہو، وہ ملحدانہ افکار کے زیر اثر پیدا ہوتا ہے۔ الحاد آج کا غالب دین ہے۔ اور اسلام کا احیاء موجودہ زمانہ میں اس وقت تک ممکن نہیں جب تک الحاد کو فکری غلبہ کے مقام سے ہٹایا نہ جائے۔

موجودہ زمانہ میں احیاء اسلام کو ممکن بنانے کے لئے دوبارہ وہی دونوں طریقے اختیار کرنے ہیں جو پہلے غلبہ کے وقت اختیار کئے گئے تھے۔ یعنی افراد کی تیاری۔ اور مخالفین حق کی مغلوبیت۔

پہلا کام ہم کو خود اپنے وسائل کے تحت انجام دینا ہے۔ جہاں تک دوسرے کام کا تعلق ہے، اس کو موجودہ زمانہ میں دوبارہ خدا نے اسی طرح بہت بڑے پیمانہ پر انجام دے دیا ہے جس طرح اس نے دور اوّل میں انجام دیا تھا۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ ان پیدا شدہ مواقع کو استعمال کیا جائے۔

۱۔ موجودہ زمانہ میں احیاء اسلام کی مہم کو کامیاب بنانے کے لئے سب سے پہلے افراد کار کی ضرورت ہے۔ گویا اب دوبارہ ایک نئے انداز سے وہی چیز درکار ہے جو حضرت ابراہیم کے منصوبہ میں مطلوب تھی۔ یعنی حقیقی معنوں میں ایک مسلم گروہ کی تیاری۔

موجودہ زمانہ میں اسلامی احیاء کی مہم چلانے کے لئے جو افراد درکار ہیں وہ عام قسم کے مسلمان نہیں ہیں بلکہ ایسے لوگ ہیں جن کے لئے اسلام ایک دریافت (Discovery) بن گیا ہو۔ وہ واقعہ جو سب سے زیادہ کسی انسان کو متحرک کرتا ہے وہ یہی دریافت کا واقعہ ہے۔ جب آدمی کسی چیز کو دریافت کے درجہ میں پائے تو اچانک اس کے اندر ایک نئی شخصیت ابھر آتی ہے۔ یقین، حوصلہ، عزم، مردانگی، فیاضی، قربانی، اتحاد، غرض وہ تمام اوصاف جو کوئی بڑا کام کرنے کے لئے درکار ہیں وہ سب دریافت کی زمین پر پیدا ہوتے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں مغربی اقوام میں جو اعلیٰ اوصاف پائے جاتے ہیں وہ سب اسی دریافت کا نتیجہ ہیں۔ مغربی قوموں نے روایتی دنیا کے مقابلہ میں سائنسی دنیا کو دریافت کیا ہے۔ یہی دریافت کا احساس ہے جس نے مغربی قوموں میں وہ اعلیٰ اوصاف پیدا کر دئے ہیں جو آج ان کے اندر پائے جاتے ہیں۔

قرن اول میں اصحاب رسول کا معاملہ بھی یہی تھا۔ ان کو خدا کا دین بطور دریافت کے ملا تھا۔ انھوں نے جاہلیت کے مقابلہ میں اسلام کو پایا تھا۔ انھوں نے شرک کے مقابلہ میں توحید کو دریافت کیا تھا ان پر دنیا کے مقابلہ میں آخرت کا انکشاف ہوا تھا۔ یہی چیز تھی جس نے ان کے اندر وہ غیر معمولی اوصاف پیدا کر دئے جن کو آج ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں۔ آج اگر اسلامی احیاء کی مہم کو موثر طور پر چلانا ہے تو دوبارہ ایسے انسان پیدا کرنے ہوں گے جنھیں اسلام دریافت کے طور پر ملا ہو نہ کہ محض نسلی وراثت کے طور پر۔

۲۔ اسلام چودہ سو سال پہلے شروع ہوا۔ اس کے بعد اس کی ایک تاریخ بنی، تمدنی عظمت اور سیاسی فتوحات کی تاریخ۔ آج جو لوگ اپنے کو مسلمان کہتے ہیں وہ اسی تاریخ کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں۔ جس قوم کی بھی یہ صورت حال ہو وہ ہمیشہ قریبی تاریخ میں اٹک کر رہ جاتی ہے۔ وہ تاریخ سے گذر کر ابتدائی اصل تک نہیں پہنچتی۔ یہی معاملہ آج مسلمانوں کا ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان

شعوری یا غیر شعوری طور پر، اپنا دین تاریخ سے اخذ کر رہے ہیں نہ کہ حقیقۃً قرآن اور سنت رسول سے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام آج کے مسلمانوں کے لئے فخر کی چیز بنا ہوا ہے نہ کہ ذمہ داری کی چیز۔ ان کے افکار و اعمال میں یہ نفسیات اس قدر رچ بس گئی ہے کہ ہر جگہ اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ اسلام کو قرآن وسنت میں دیکھئے تو وہ سراسر ذمہ داری اور مسئولیت کی چیز نظر آئے گا۔ اس کے برعکس اسلام کو جب اس کی تمدنی تاریخ اور سیاسی واقعات کے آئینہ میں دیکھا جائے تو وہ فخر اور عظمت کی چیز معلوم ہونے لگتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی تمام بڑی بڑی انقلابی تحریکیں اسی جذبۂ فخر کے تحت اٹھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ وقتی ہنگامے پیدا کر کے ختم ہوگئیں۔ کیوں کہ فخر کا جذبہ نمائش اور ہنگامے کی طرف لے جاتا ہے۔ اور مسئولیت کا جذبہ حقیقی اور سنجیدہ عمل کی طرف۔

اسلامی احیاء کی مہم کو موثر طور پر چلانے کے لئے وہ افراد درکار ہیں جنھوں نے اسلام کو قرآن و حدیث کی ابتدائی تعلیمات سے اخذ کیا ہو نہ کہ بعد کو بننے والی تمدنی اور سیاسی تاریخ سے۔ قرآن و حدیث سے دین کو اخذ کرنے والے لوگ ہی سنجیدگی اور احساس ذمہ داری کے تحت کوئی حقیقی مہم چلا سکتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ تاریخ سے اپنا دین اخذ کریں وہ صرف اپنے فخر کا جھنڈا بلند کریں گے، وہ کسی نتیجہ خیز عمل کا ثبوت نہیں دے سکتے۔

مسلمان موجودہ زمانہ میں ایک شکست خوردہ قوم بنے ہوئے ہیں۔ پوری مسلم دنیا پر ایک قسم کا احساس مظلومی (Persecution complex) چھایا ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہی تاریخ سے دین کو اخذ کرنا ہے۔ ہم نے تاریخی عظمت کو دین سمجھا۔ ہم نے "لال قلعہ" اور "فتح پور سیکری" میں اپنی اسلامیت کا تشخص دریافت کیا۔ چوں کہ موجودہ زمانہ میں دوسری قوموں نے ہم سے یہ چیزیں چھین لیں، اس لئے ہم فریاد و ماتم میں مشغول ہو گئے۔ اگر ہم ہدایت ربانی کو دین سمجھتے تو ہم کبھی احساس محرومی کا شکار نہ ہوتے۔ کیوں کہ وہ ایسی چیز ہے جس کو کوئی طاقت ہم سے کبھی چھین نہیں سکتی۔ ہم نے چھن جانے والی چیزوں کو اسلام سمجھا اس لئے جب وہ چھن گئی تو ہم شکایت اور محرومی کا پیکر بن کر رہ گئے۔ اگر ہم نہ چھننے والی چیز کو اسلام سمجھتے تو ہمارا کبھی وہ حال نہ ہوتا جو آج ہر طرف نظر آرہا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ جو چیز ہمارے پاس ابھی تک بغیر چھنی ہوئی محفوظ ہے اس کا ہمیں شعور نہیں۔ اور جو چیز ہم سے چھن گئی ہے اس کے لئے ہم شکایت اور احتجاج میں مصروف ہیں۔

اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ساری دنیا میں مسلمان دوسری قوموں سے لڑائی جھگڑے میں مصروف ہیں۔ وہ اسلام کو اپنی قومی عظمت کا نشان سمجھتے ہیں۔ اس لئے جو لوگ انھیں اس عظمت کو چھینتے ہوئے نظر آتے ہیں ان کے

خلاف وہ لڑنے کے لئے کھڑے ہوگئے ہیں۔ کہیں یہ لڑائی الفاظ کے ذریعہ ہو رہی ہے اور کہیں ہتھیاروں کے ذریعہ۔ اس صورت حال نے مسلمانوں کے پورے رویہ کو منفی بنا دیا ہے۔ اسلام اگر ان کو ربانی ہدایت کے طور پر ملتا تو وہ محسوس کرتے کہ ان کے پاس دوسری قوموں کو دینے کے لئے کوئی چیز ہے۔ وہ اپنے کو دینے والا سمجھتے اور دوسرے کو لینے والا۔ جب کہ موجودہ حالت میں وہ سمجھتے ہیں کہ وہ چھنے ہوئے لوگ ہیں اور دوسرے چھیننے والے لوگ۔ ہمارے اور دوسری قوموں کے درمیان حقیقی رشتہ داعی اور مدعو کا رشتہ ہے۔ مگر تاریخی اسلام کو اسلام سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دوسری قومیں ہمارے لئے صرف حریف اور رقیب بن کر رہ گئی ہیں۔ ہمارے اور دوسری قوموں کے درمیان جب تک یہ حریفانہ فضا باقی ہے، اسلامی احیاء کا کوئی حقیقی کام شروع نہیں کیا جا سکتا۔

پہلے ہی مرحلہ میں ایسا نہیں ہو سکتا کہ تمام مسلمانوں کو حریفانہ نفسیات سے پاک کر دیا جائے۔ مگر کم سے کم ایک ایسی ٹیم کا ہونا ضروری ہے جس کے افراد اپنی حد تک اس ذہنی فضا سے نکل چکے ہوں۔ جن کے اندر ایسی فکری تبدیلی آچکی ہو کہ دوسری قوموں کو وہ اپنا مدعو سمجھیں نہ کہ مادی حریف اور قومی رقیب۔ یہ بظاہر سادہ سی بات انتہائی مشکل بات ہے۔ اس کے لئے اپنے آپ کو ذبح کرنا پڑتا ہے۔ اپنے اور دوسری قوموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ قائم کرنے کی لازمی شرط یہ ہے کہ ہم یک طرفہ طور پر تمام شکایتوں کو بھلا دیں۔ ہر قسم کے مادی نقصانات کو گوارا کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ داعی اور مدعو کا رشتہ داعی کی طرف سے یک طرفہ قربانی پر قائم ہوتا ہے۔ اور موجودہ دنیا میں بلاشبہ یہ سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔

یہ اور اس طرح کے دوسرے اوصاف ہیں جو ان لوگوں میں ہونا ضروری ہیں جو موجودہ زمانہ میں احیاء اسلام کی مہم کے لئے اٹھیں۔ ایسے افراد تیار کرنے کے لئے موجودہ زمانہ میں دوبارہ اسی قسم کا ایک منصوبہ درکار ہے جو دور اول میں خیر امت کے اخراج (آل عمران ۱۱۰) کے لئے زیر عمل لایا گیا تھا۔ موجودہ زمانہ کے اعتبار سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج یہ ضرورت ہے کہ جدید طرز کی ایک اعلیٰ تربیت گاہ قائم کی جائے۔ یہ تربیت گاہ تمدنی ماحول سے الگ قدرت کی بے آمیز فضا میں قائم ہونی چاہیے۔ یہ تربیت گاہ گویا دوبارہ قوم کے کچھ اعلیٰ افراد کو وادی غیر ذی زرع میں بسانے کے ہم معنی ہوگی۔

مذکورہ تربیت گاہ کو کامیاب طور پر چلانے کے لئے کچھ ایسے ابراہیمی والدین درکار ہیں جو اپنی اولاد کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہوں۔ وہ اس پر راضی ہو جائیں کہ ان کی ذہین اولاد کو وقت

کے اعلیٰ معاشی مواقع سے محروم کرکے ایک ایسے ماحول میں ڈال دیا جائے جہاں سب کچھ دے کر بھی تعلق باللہ اور فکر آخرت کے سوا کوئی اور چیز نہ ملتی ہو۔ اس طرح کی ایک تربیت گاہ، فلپ ہٹی کے مذکورہ الفاظ میں، دوبارہ ایک قسم کی "نرسری آف ہیروز" بنانے کے ہم معنی ہوگی۔ جب تک اس قسم کے افراد کی ایک قابل لحاظ ٹیم تیار نہ ہوجائے، احیاء اسلام کی جانب کوئی حقیقی قدم نہیں اٹھایا جاسکتا۔

اس قسم کی تربیت گاہ کا قیام گویا جدید زمانہ کے لحاظ سے اس آیت قرآنی کی تعمیل ہوگی ——

ولولا نفر من کل فرقة منهم طائفة لیتفقهوا فی الدین ولینذروا قومهم اذا رجعوا الیهم ولعلهم یرجعون۔ یعنی قوم کے کچھ ذہین افراد کو عام ماحول سے الگ کرکے ایک علیحدہ ماحول میں لایا جائے اور وہاں متعین مدت تک خصوصی تعلیم وتربیت کے ذریعہ انھیں اس کے لئے تیار کیا جائے کہ وہ موجودہ زمانہ میں احیاء اسلام کی مہم کو کامیابی کے ساتھ چلاسکیں۔ وہ اہل عالم کے لئے منذر اور مبشر بن سکیں۔

دور اول میں اسلامی انقلاب کو ممکن بنانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص اہتمام یہ کیا کہ ایران اور روم کی سلطنتیں جو اس زمانہ میں دین توحید کی سب سے بڑی حریف تھیں، ان کو باہم ٹکرا کر اتنا کمزور کردیا کہ اہل اسلام کے لئے ان کو مغلوب کرنا آسان ہوگیا۔

خدا کی یہی مدد موجودہ زمانہ کے اہل ایمان کے لئے ایک اور شکل میں ظاہر ہوئی ہے۔ اور وہ ہے کائنات کے بارہ میں ایسی معلومات کا سامنے آنا جو دینی حقیقتوں کو معجزاتی سطح پر ثابت کر رہی ہیں۔ قدیم زمانہ میں توہماتی طرز فکر کا غلبہ تھا، اس بنا پر عالم کائنات کے بارہ میں انسان نے عجیب عجیب بے بنیاد رائیں قائم کر رکھی تھیں۔ کائنات کو قرآن میں آلاء رب (کرشمۂ خدا) خدا کہا گیا ہے۔ مگر یہ خدائی کرشمہ توہماتی مفروضوں کے پردہ میں چھپا ہوا تھا۔ دور اوّل کے اسلامی انقلاب کے نتائج میں سے ایک نتیجہ یہ ہے کہ مظاہر فطرت جو اس سے پہلے پرستش کا موضوع بنے ہوئے تھے وہ انسان کے لئے تحقیق و تسخیر کا موضوع بن گئے۔ اس طرح تاریخ انسانی میں پہلی بار واقعاتِ فطرت کو خالص علمی انداز میں جاننے کا ذہن پیدا ہوا۔ یہ ذہن مسلسل بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ یورپ پہنچا۔ یہاں ترقی پاکر وہ اس انقلاب کا سبب بنا جس کو موجودہ زمانہ میں سائنسی انقلاب کہا جاتا ہے۔

سائنس نے گویا توہماتی پردہ کو ہٹا کر کرشمۂ خدا کا کرشمہ خدا ہونا ثابت کردیا۔ اس نے مظاہر فطرت کو "معبود" کے مقام سے ہٹا کر "مخلوق" کے مقام پر رکھ دیا۔ حتی کہ یہ نوبت آئی کہ چاند، جس کو قدیم انسان معبود سمجھ کر پوجتا تھا، اس پر اس نے اپنے پاؤں رکھ دئے اور وہاں اپنی مشینیں

اتار دیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ سائنس نے جو نئے دلائل فراہم کئے ہیں ان کو صحیح طور پر استعمال کیا جائے تو دین توحید کی دعوت کو اس برتر سطح پر پیش کیا جا سکتا ہے جس کے لئے اس سے پہلے معجزات ظاہر کئے جاتے تھے۔

زمین و آسمان میں جو چیزیں ہیں وہ اس لئے ہیں کہ ان کو دیکھ کر آدمی خدا کو یاد کرے۔ مگر انسان نے خود انھیں چیزوں کو خدا سمجھ لیا۔ یہ ایک قسم کا انحراف تھا۔ اسی قسم کا انحراف موجودہ زمانہ میں سائنسی معلومات کے بارہ میں پیش آرہا ہے۔ سائنسی تحقیق سے جو حقائق سامنے آئے ہیں وہ سب خدا کی خدائی کا ثبوت ہیں۔ وہ انسان کو خدا کی یاد دلانے والے ہیں۔ مگر موجودہ زمانہ کے ملحد مفکرین نے دوبارہ ایک انحراف کیا۔ انھوں نے سائنسی حقیقتوں کو غلط رخ دے کر یہ کیا کہ جس چیز سے خدا کا ثبوت نکل رہا تھا اس کو انھوں نے اس بات کا ثبوت بنا دیا کہ یہاں کوئی خدا نہیں ہے۔ بلکہ سارا نظام ایک مشینی عمل کے تحت اپنے آپ چلا جا رہا ہے۔

سائنس نے جو کائنات دریافت کی ہے وہ ایک حد درجہ بامعنی اور بامقصد کائنات ہے۔ جدید دریافتوں نے ثابت کیا ہے کہ ہماری دنیا منتشر مادہ کا بے معنی انبار نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک اعلیٰ درجہ کا منظم کارخانہ ہے۔ دنیا کی تمام چیزیں بے حد ہم آہنگی کے ساتھ ایک ایسے رخ پر سفر کرتی ہیں جو ہمیشہ بامقصد نتائج پیدا کرنے والے ہوں۔ کائنات میں نظم اور مقصدیت کی دریافت واضح طور پر ناظم کی موجودگی کا اقرار ہے۔ وہ کائنات کے پیچھے خدائی کارفرمائی کا یقینی ثبوت ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے بے خدا مفکرین نے یہ کیا کہ اس سائنسی دریافت کا رخ الحاد کی طرف موڑ دیا۔ انھوں نے کہا کہ جو کچھ ثابت ہوا ہے وہ بجائے خود واقعہ ہے۔ مگر اس کا کیا ثبوت کہ وہ کوئی نتیجہ (End) ہے۔ عین ممکن ہے کہ وہ محض ایک اثر (Effect) ہو۔ یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ یہاں کوئی ذہن ہو جو شعور اور ارادہ کے تحت بالقصد واقعات کو ایک خاص انجام کی طرف لے جا رہا ہو۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ واقعات کے بے شعور عمل کے اثر سے اپنے آپ ایک چیز برآمد ہو رہی ہو جو اتفاق سے بامعنی بھی ہو — یہ بے معنی توجیہہ خود ایک ارادہ کے تحت وجود میں آئی ہے۔ پھر کیسی عجیب بات ہے کہ بامعنی کائنات کو بلا ارادہ کارفرمائی مان لیا جائے۔

ایک طرف سائنس کے ظہور کے بعد ملحد مفکرین نے بہت بڑے پیمانہ پر سائنس کو الحاد کا رخ دینے کی کوشش کی ہے۔ دوسری طرف اس کے مقابلہ میں مذہبی مفکرین کی کوششیں اتنی ہی کم ہیں۔ پچھلے سو سال کے اندر ایک طرف ہزاروں کی تعداد میں اعلیٰ علمی کتابیں چھپی ہیں جن کے

ذریعہ سائنس سے غلط طور پر الحاد کو برآمد کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسری طرف دینی مفکرین کی صف میں چند ہی قابل ذکر علمی کوششوں کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے ایک قابل قدر کتاب سر جیمز جینز کی پراسرار کائنات (The Mysterious Universe) ہے۔ اس کتاب میں لائق مصنف نے نظریہ تعلیل (Principle of Causation) کو خالص سائنسی استدلال کے ذریعہ منہدم کر دیا ہے جس کو موجودہ زمانہ میں خدا کا مشینی بدل سمجھ لیا گیا تھا۔

موجودہ صدی کے نصف آخر میں بے شمار نئے حقائق انسان کے علم میں آئے ہیں جو نہایت برتر سطح پر دینی عقائد کی حقانیت کو ثابت کر رہے ہیں۔ مگر ابھی تک کوئی ایسا دینی مفکر سامنے نہیں آیا جو ان سائنسی معلومات کو دینی صداقتوں کے اثبات کے طور پر مدون کرے۔ اگر یہ کام اعلیٰ سطح پر ہوسکے تو وہ دعوت توحید کے حق میں ایک علمی معجزہ ظاہر کرنے کے ہم معنی ہوگا۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ماضی میں جتنے پیغمبر آئے سب کی پیغمبری پر ان کے ہم عصر مخاطبین نے شک کیا (ہود ۶۲) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی ابتدائً یہی صورت پیش آئی کہ آپ کے مخاطبین اول آپ کی نبوت پر شک کرتے رہے (ص ۸) تاہم اسی کے ساتھ قرآن میں یہ اعلان کیا گیا کہ آپ کو مقام محمود پر کھڑا کیا جائے گا (عسیٰ ان یبعثک ربک مقاما محمودا) اس اعلان کا مطلب یہ تھا کہ آپ کی نبوت شک کے مرحلہ سے گذر کر ایک ایسے مرحلہ میں پہنچے گی جب وہ مکمل طور پر تسلیم شدہ نبوت بن جائے۔ محمود (قابل تعریف) ہونا تسلیم واعتراف کا آخری درجہ ہے۔

ہر نبی جب پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنی قوم کے اندر ایک ایسی شخصیت ہوتا ہے جس کو لوگ شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ "معلوم نہیں یہ واقعۃً پیغمبر ہیں یا صرف دعویٰ کر رہے ہیں" اس طرح کے خیالات لوگوں کے ذہن میں گھومتے ہیں اور آخر وقت تک ختم نہیں ہو پاتے۔ پیغمبری اپنے ابتدائی دور میں صرف دعویٰ ہوتی ہے۔ وہ اپنے دعویٰ کا ایسا ثبوت نہیں ہوتی جس کو ماننے پر لوگ مجبور ہو جائیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب بھی کوئی پیغمبر آیا وہ اپنی قوم کی نظر میں ایک نزاعی شخصیت بن گیا۔ کیونکہ پیغمبر کی صداقت کو جاننے کے لئے لوگوں کے پاس اس وقت اس کا صرف دعویٰ تھا۔ اس کے حق میں مسلمہ تاریخی دلائل ابھی جمع نہیں ہوئے تھے۔ اس قسم کے دلائل ہمیشہ بعد کو وجود میں آتے ہیں۔ مگر عام طور پر انبیاء کا معاملہ اس بعد کے مرحلہ تک پہنچ نہ سکا۔

دوسرے پیغمبر نزاعی دور میں شروع ہوئے اور نزاعی دور ہی میں ان کا اختتام ہو گیا۔ کیوں کہ ان کے بعد ان کے پیغام کی پشت پر ایسا گروہ جمع نہ ہوسکا جو ان کی سیرت اور ان کے کلام

کو مکمل طور پر محفوظ رکھ سکے۔ دوسرے انبیاء اپنے زمانہ میں لوگوں کے لئے اس لئے نزاعی تھے کہ وہ ابھی اپنی تاریخ کے آغاز میں تھے، بعد کے دور میں وہ دوبارہ نزاعی ہو گئے۔ کیوں کہ بعد کو ان کی جو تاریخ بنی وہ انسانی علم کے معیار پر تسلیم شدہ نہ تھی۔

نبیوں کی فہرست میں اس اعتبار سے صرف پیغمبر آخر الزماں کا استثنار ہے۔ آپ نے اگرچہ دوسرے نبیوں کی طرح، اپنی نبوت کا آغاز نزاعی دور سے کیا۔ مگر بعد کے دور میں آپ کو اتنی غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی کہ زمین کے بڑے حصہ میں آپ کا اور آپ کے ساتھیوں کا اقتدار قائم ہو گیا ایک صدی سے بھی کم عرصہ میں آپ کے دین نے ایشیا اور افریقہ کی بڑی طاقتوں کو زیر و زبر کر ڈالا۔ پیغمبر آخر الزماں کو جتنے چیلنج پیش آئے سب میں وہ فاتح رہے۔ آپ نے جتنی پیشین گوئیاں کیں سب مکمل طور پر پوری ہوئیں۔ جو طاقت بھی آپ سے ٹکرائی وہ پاش پاش ہو گئی۔ آپ کی زندگی میں ایسے واقعات پیش آئے جن کی بنا پر معاصر تاریخ میں آپ کا ریکارڈ قائم ہو گیا۔ ساری تاریخ انبیاء میں آپ کو یہ غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی کہ آپ کی نبوت نزاعی مرحلہ سے نکل کر محمودی مرحلہ میں پہنچ گئی۔ آپ کا کلام اور آپ کا کارنامہ دونوں اس طرح محفوظ حالت میں باقی رہے کہ کسی کے لئے آپ کے بارہ میں شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

موجودہ زمانہ میں دین حق کے داعیوں کو ایک ایسا خصوصی موقع (Advantage) حاصل ہے جو تاریخ کے پچھلے ادوار میں کسی داعی گروہ کو حاصل نہ تھا۔ وہ یہ کہ ہم آج اس حیثیت میں ہیں کہ توحید کی دعوت کو مسلّمہ (Established) نبوت کی سطح پر پیش کر سکیں۔ جب کہ اس سے پہلے توحید کی دعوت صرف نزاعی (Controversial) نبوت کی سطح پر پیش کی جا سکتی تھی۔

دوسری امتیں اگر نبوت نزاعی کی وارث تھیں تو ہم نبوت محمودی کے وارث ہیں۔ مسلمانوں کو اقوام عالم کے سامنے شہادت حق کا جو کام انجام دینا ہے اس کے لئے خدا نے آج ہر قسم کے موافق مواقع مکمل طور پر کھول دئے ہیں۔ اس کے باوجود اگر مسلمان اس کار شہادت کو انجام نہ دیں۔ یا شہادت دین کے نام پر قومی جھگڑے کھڑے کرنے لگیں تو مجھے نہیں معلوم کہ قیامت کے دن وہ رب العلمین کے سامنے کیوں کر بری الذمہ ہو سکتے ہیں۔

نومبر ۱۹۸۳ کے آخری ہفتہ میں لاہور میں قرآنی سیمنار ہوا۔ اس موقع پر راقم الحروف کو ایک مقالہ پڑھنے کی دعوت دی گئی۔ زیر نظر مقالہ اسی سیمنار میں پیش کرنے کے لئے تیار کیا گیا۔

حیوانیت کی سطح پر

حضرت سلیمانؑ کے زمانہ حکومت (۹۷۳-۱۰۱۳ ق م) میں بحر قلزم کی مشرقی شاخ کے کنارے ایلات (Elath) کے مقام پر یہودیوں کی آبادی تھی۔ انھوں نے قانون سبت کی خلاف ورزی کی۔ ان کی شریعت میں سبت (سنیچر) کے دن معاشی سرگرمیاں ممنوع تھیں۔ مگر وہ اس دن مچھلی کا شکار کرنے لگے۔ سنیچر کے دن مچھلیاں کثرت سے دریا میں آتی تھیں اور بقیہ دنوں میں پانی کے نیچے چلی جاتی تھیں۔ یہود نے یہ شرعی تدبیر کی کہ دریا کے کنارے گڑھے بنائے۔ وہ دریا کا پانی کاٹ کر گڑھے میں ملا دیتے۔ سنیچر کے دن جب مچھلیاں گڑھے میں آجاتیں تو وہ نکلنے کا راستہ بند کر دیتے۔ اگلے دن اتوار کو وہ ان مچھلیوں کو پکڑ لیتے۔

یہ تدبیر وہ اس لئے کرتے تھے تاکہ ان پر یہ بات صادق نہ آئے کہ وہ سبت کے دن شکار کرتے ہیں۔ دین کے نام پر یہ بے دینی اللہ کو اتنی زیادہ ناپسند ہوئی کہ ان پر اللہ کی لعنت ہوئی۔ وہ بندر اور سور بنا دئے گئے (مائدہ ۶۰) ـــــ عملاً یہی حالت اگرچہ پوری قوم یہود کی تھی۔ تاہم ایک خاص مقام کے یہودیوں کے باطن کو غالباً ظاہری طور پر بھی مجسم کر دیا گیا تاکہ دوسروں کے لئے عبرت ہو (بقرہ ۶۶)

بندر اور سور بنانے سے کیا مراد ہے، اس بارہ میں مفسرین کی دو رائیں ہیں۔ اکثریت نے ظاہر الفاظ پر قیاس کرتے ہوئے یہ مراد لیا ہے کہ مذکورہ گروہ حقیقی معنوں میں بندر اور سور بنا دئے گئے۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے، اس سے کوئی واضح بات ثابت نہیں۔ حدیث میں صرف اتنا ہے کہ آپ سے پوچھا گیا کہ موجودہ بندر اور سور کیا قدیم مسخ شدہ اقوام کی نسلیں ہیں۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ یہ حیوانات ہمیشہ سے اسی طرح ہیں (تفسیر ابن کثیر، الجزء الثانی)

مجاہد کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ وہ بندر کی صورت میں تبدیل نہیں کئے گئے بلکہ ان کے دل مسخ کر دئے گئے۔ (قال مسخت قلوبهم ولم يمسخوا قردة۔ وانما هو مثل ضربه الله: كمثل الحمار يحمل اسفارا) ابو العالیہ کا قول ہے کہ كونوا قردة خاسئين سے مراد یہ ہے کہ وہ پست اور حقیر بنا دئے گئے (یعنی اذلة صاغرين) یہی رائے قتادہ اور ربیع اور ابو مالک کی بھی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۱۰۶-۱۰۵) موجودہ زمانہ کے مفسرین میں شیخ رشید رضا نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے (المنار)

سور کی خصوصیت کیا ہے۔ ستھری چیز کو چھوڑ کر، گندی چیز کو اپنی خوراک بنانا۔ اس کی ایک صورت وہ ہے جو کمائی اور لین دین میں ظاہر ہوتی ہے۔ آدمی حلال ذرائع پر قانع نہ رہ کر حرام سے اپنا پیٹ

بھرنے لگتا ہے (مائدہ ۔ ۶۳)۔ دوسری صورت وہ ہے جس کو قرآن میں ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے :
اگر وہ ہدایت کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنا راستہ نہ بنائیں اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنا راستہ بنالیں (اعراف ۱۴۶)

ایسے لوگوں کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ وہ مثبت چیزوں کے بجائے منفی چیزوں کی طرف دوڑنے لگتے ہیں، ان کو اصلاح کے کاموں کی طرف رغبت نہیں ہوتی۔ البتہ ایسے کاموں کی طرف وہ تیزی سے لپکتے ہیں جن کا نتیجہ نسلوں اور کھیتیوں کی ہلاکت ہو۔

ان کے سامنے تعمیری کام کے مواقع کھلے ہوتے ہیں۔ مگر وہ ان کو چھوڑ کر تخریب کے راستوں میں تیزی دکھاتے ہیں۔ ابنائے نوع کے لئے نفع بخش بننے کا شوق ان میں نہیں ابھرتا۔ البتہ ان کو نقصان پہنچانے کے نعرہ پر وہ بآسانی جمع ہو جاتے ہیں۔ خاموش خدمت میں ان کے لئے اپیل نہیں ہوتی البتہ نمائشی ہنگاموں میں وہ خوب دل چسپی دکھاتے ہیں۔ حقیقی فائدہ کے منصوبوں میں ان کے لئے کوئی کشش نہیں ہوتی۔ البتہ بے فائدہ مشغلوں میں وہ اپنا وقت اور مال خوب خرچ کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ ان کو خدائے واحد کی پرستش کی طرف بلائیے تو وہ لبیک نہ کہیں گے البتہ زندہ یا مردہ شخصیتوں کی پوجا کے نام پر وہ جوق در جوق اکٹھا ہو جائیں گے۔

بے دینی کو دین کے نام پر کرنا بدترین جرم ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دھیرے دھیرے آدمی کے اندر سے صحیح اور غلط کا فرق مٹ جاتا ہے۔ وہ ایک بے حس انسان بن جاتا ہے۔ دین اور بے دینی دونوں اس کو یکساں دکھائی دینے لگتے ہیں۔ وہ انسانیت کی سطح سے گر کر حیوانیت کی سطح پر آجاتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ نوبت آتی ہے جب کہ اس میں بندر اور سور کی اخلاقیات پیدا ہو جاتی ہیں۔

بندر کی خصوصیت کیا ہے۔ فساد اور بے حیائی۔ کسی مکان میں بندروں کا غول داخل ہو جائے تو وہ فوراً بے معنی اچھل کود اور توڑ پھوڑ شروع کر دے گا۔ ایسا ہی کچھ حال اس قوم کا ہو جاتا ہے۔ وہ زبان سے خدا کا انکار نہیں کرتی۔ تاہم عملاً وہ خدا کی زمین پر اس طرح رہنے لگتی ہے جیسے اس زمین کا کوئی مالک نہیں ہے۔ جیسے نہ کبھی خدا سے اس کا سامنا ہونا ہے اور نہ اپنے کئے کا حساب دینا ہے ——— بدنظمی، غیر ذمہ دارانہ زندگی، بے معنی کارروائیاں، آپس کی چھین جھپٹ، ایک دوسرے پر غرانا، ہمدردی اور انصاف کے بجائے ظلم و فساد کو اپنا شیوہ بنا لینا، یہ اس کی عام زندگی ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگ بظاہر انسان مگر عملاً بندر صفت ہو جاتے ہیں۔ وہ انسانوں کی آبادی میں اس طرح رہنے لگتے ہیں جیسے بندر جنگلوں کی آبادی میں۔

یہ خوش اخلاقی

خوش اخلاقی کی سب سے زیادہ عام قسم وہ ہے جو بداخلاقی کی بدترین قسم ہے۔ اس کی ایک صورت وہ ہے جس کو تاجرانہ اخلاق کہا جا سکتا ہے۔ ایک کامیاب دکاندار اپنے ہر گاہک سے انتہائی خوش اخلاقی کا معاملہ کرتا ہے۔ مگر اس خوش اخلاقی کے پیچھے ذاتی مفاد کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ دکان پر آنے والا گاہک اگر اپنا لبادہ اتار کر چندہ مانگنے والا آدمی بن جائے تو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ دکاندار کی خوش اخلاقی کی حقیقت کیا تھی۔

خوش اخلاقی کی ایک قسم وہ ہے جس کو "تہذیب" کہا جا سکتا ہے۔ یہ قسم خاص طور پر جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے درمیان رائج ہے۔ یہ لوگ جب باہم ملیں گے تو وہ نہایت ترشے ہوئے الفاظ میں بات کریں گے۔ ایک بے معنی رائے کو بھی خوبصورت علمی الفاظ میں بیان کریں گے۔ آتشیں موضوعات پر بھی وہ اس طرح بولیں گے جیسے کہ وہ برف کے موضوع پر بول رہے ہیں۔ اپنے مخالف سے بات کرتے ہوئے ایسا رویہ اختیار کریں گے جیسے ان کا اختلاف سراسر علمی اختلاف ہے۔ اس کو ذاتی مفاد سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن زیادہ گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ان سب کی حقیقت مصنوعی اخلاقیات سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ ان کا اول و آخر مقصد سماج میں مہذب انسان کہلایا جانا ہے نہ کہ فی الواقع اخلاقی اصولوں پر عمل کرنا۔

خوش اخلاقی کی ایک اور قسم وہ ہے جو "بڑوں" کے یہاں پائی جاتی ہے۔ جو لوگ ان سے چھوٹے بن کر ملیں ان سے وہ پوری طرح خوش اخلاق بنے رہتے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ مسلّم طور پر بڑائی کا مقام حاصل کر چکے ہوں ان کے ساتھ بھی ان کا رویہ ہمیشہ خوش اخلاقی کا ہوتا ہے۔ مگر ان دونوں کا اخلاق سے کوئی تعلق نہیں۔ اول الذکر کے ساتھ ان کی خوش اخلاقی دراصل ان کے اس عمل کی قیمت ہوتی ہے کہ انھوں نے ان کی متکبرانہ نفسیات کے لئے غذا فراہم کی۔ ثانی الذکر کے ساتھ ان کی خوش اخلاقی اس لئے ہوتی ہے کہ ان کے ساتھ اپنے کو منسوب کرنا عوام کی نظر میں ان کی یہ تصویر بناتا ہے کہ وہ بھی بڑوں کی فہرست میں شامل ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ یہ "بڑے" اس وقت اپنی خوش اخلاقی کھو دیتے ہیں جب کہ کوئی آدمی ان کی بڑائی کو چیلنج کرے، جب وہ کوئی ایسی بات کہدے جس سے ان کی متکبرانہ نفسیات پر زد پڑتی ہو۔ ایسے شخص کے مقابلہ میں وہ فوراً اپنا لبادہ اتار دیتے ہیں۔ ان کی خوش اخلاقی اچانک بدترین بداخلاقی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دل چسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کر کے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔ بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

'Introduction to Islam' Series

1. The Way to Find God
2. The Teachings of Islam
3. The Good Life
4. The Garden of Paradise
5. The Fire of Hell

The series provides the general public with an accurate and comprehensive picture of Islam—the true religion of submission to God. The first pamphlet shows that the true path is the path that God has revealed to man through His prophets. The second pamphlet is an introduction to various aspects of the Islamic life under forty-five separate headings. Qur'anic teachings have been summarized in the third pamphlet in words taken from the Qur'an itself. In the fourth pamphlet the life that makes man worthy of Paradise has been described and in the last pamphlet the life that will condemn him to Hell-fire.

Price per set: Rs 24.00

Maktaba Al-Risala

C-29 Nizamuddin West New Delhi 110013

Regd. D (DN)No.532
Regd. R.N. No. 28822/76

August 1984
Issue No 93

AL-RISALA MONTHLY

C-29 NIZAMUDDIN WEST NEW DELHI 110 013 Tel. 611128

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن جلد اوّل	50/-
الاسلام	20/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-
ظہورِ اسلام	25/-
احیاءِ اسلام	15/-
پیغمبرِ انقلاب	25/-
دین کیا ہے	2/-
قرآن کا مطلوب انسان	5/-
تجدید دین	3/-
اسلام دینِ فطرت	3/-
تعمیرِ ملت	3/-
تاریخ کا سبق	3/-
مذہب اور سائنس	5/-
عقلیاتِ اسلام	3/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-
تعارف اسلام	3/-
اسلام پندرھویں صدی میں	2/-
راہیں بند نہیں	3/-
ایمانی طاقت	3/-
اتحادِ ملت	3/-

سبق آموز واقعات	3/-
زلزلۂ قیامت	4/-
حقیقت کی تلاش	3/-
پیغمبرِ اسلام	3/-
آخری سفر	3/-
حقیقتِ حج	2/-
اسلامی دعوت	3/-
خدا اور انسان	3/-

تعارفی سٹ

سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	3/-
حیاتِ طیبہ	3/-
باغِ جنت	3/-
نارِ جہنم	3/-

English Publications

The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Mohammad: The Ideal Character	3/-

مکتبہ الرسالہ سی - ۲۹ ، نظام الدین ویسٹ ، نئی دہلی ۱۳